معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵% ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۸ ماہ ربیع الاول ۱۴۱۷ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۹۶ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

پروفیسر ڈاکٹر مقبول احمد صدر مسلم مجلس مشاورت مغربی بنگال کو دار المصنفین سے بڑا لگاؤ ہے، وہ اس کے لئے برابر فکر مند رہتے ہیں، اور اپنے وسائل و ذرائع سے اسے مالی فوائد بھی پہنچانا چاہتے ہیں، کئی ماہ قبل جب وہ اعظم گڈھ تشریف لائے تھے، تو میں نے ان سے اپنی بیماری عرق النسا کا ذکر کیا، اس کے علاج اور دار المصنفین کی آمدنی بڑھانے پر غور و خوض کے لئے انہوں نے کلکتہ آنے کی دعوت دی، ۷/ جولائی کو میں وہاں جانے کے لئے روانہ ہوا، ٹرین رات میں ۱۱.۱۵ بجے شاہ گنج میں ملنے والی تھی مگر اسی روز ۱۰ بجے دن میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ تھا، اس سے فرصت پاکر ۵ بجے شام شاہ گنج پہنچا تاکہ مدرسہ بدر الاسلام کے روح رواں اور اپنے خاص کرم فرما مولانا عثمان احمد قاسمی کی صحبت میں چند گھنٹے گزاروں، وہ اپنی طبیعت کی خرابی اور صحت کی کمزوری کے باوجود میری دل جوئی کے لئے میرے پاس بیٹھے رہے، ان کو اردو شعر و سخن کا اچھا ذوق ہے، بات بات میں مختلف غزل گو شعرا کے اشعار سے مجلس کو پر کیف بنائے ہوئے تھے۔ عشا کی نماز اور کھانے سے فارغ ہوا تو مدرسہ کے دو اساتذہ کے ساتھ اسٹیشن روانہ کیا، گاڑی لیٹ تھی مگر وہ دونوں حضرات مجھے اس پر بیٹھا کر ہی واپس ہوئے۔

کلکتہ میں ۸/ جولائی کو ۴ بجے شام ہی سے ڈاکٹر صاحب میری آمد کے منتظر تھے، مگر گاڑی لیٹ ہونے کی وجہ سے میں ۹ بجے شب میں پہنچا، ان کی زندگی بڑی مشغول اور مرتب ہے، ان کے ہر کام کا وقت مقرر ہے، میرا نظام الاوقات بھی انہوں نے تیار کر رکھا تھا، ۱۴/ جولائی کو میری تقریر کا پروگرام تھا، اس سے پہلے کا وقت ان سے تبادلہ خیال، ان کی زیر نگرانی میرے طبی معائنہ اور لوگوں سے ملنے جلنے میں صرف ہوا، دو سال پہلے میں مسلم پروگریسو سوسائٹی کی دعوت پر کلکتہ گیا تھا، اس کے اعزازی جنرل سکریٹری زین العابدین صاحب کو اطلاع ہوئی تو فوراً ملنے آئے اور سوسائٹی کے آفس میں اس کے ارکان سے ملاقات اور تبادلہ خیال کا پروگرام بھی رکھا، ایک روز سوسائٹی کے صدر نے اپنے دولت خانہ پر ایک پر تکلف عشائیہ دیا، سوسائٹی کے ارکان بڑے متحرک اور فعال ہیں، وہ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کا مخلصانہ جوش و ولولہ رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے عزائم اور ارادوں کی تکمیل کا سامان کرے، زین العابدین صاحب بار بار ملنے آتے رہے، وہ اور سوسائٹی کے رکن یحییٰ صاحب اسٹیشن چھوڑنے بھی آئے۔

جناب احمد سعید ملیح آبادی ایڈیٹر اجالا و آزاد ہند برسوں دار المصنفین میں مولانا سید ریاست علی ندوی اور مدرسۃ الاصلاح میں مولانا شبلی متکلم ندوی کے زیر تعلیم و تربیت رہ چکے ہیں، اس لئے انکو ان اداروں سے بڑا تعلق ہے، ان سے فون پر بات ہوئی تو فوراً ملاقات کے لئے آنا چاہا مگر ڈاکٹر صاحب نے ان کو رات کے کھانے پر بلایا، ان سے قوم و ملک کے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال ہوا، مدرسۃ الاصلاح اور دار المصنفین کے گزشتہ اور موجودہ حالات بھی زیر بحث آئے، ان سے اور ڈاکٹر صاحب سے میں نے عرض کیا کہ کارکنان دار المصنفین کا منصوبہ یہ ہے کہ اس کی جو کتابیں عرصہ سے ختم ہو گئی ہیں انہیں دوبارہ موجودہ معیار کے مطابق اہتمام سے شائع کیا جائے، دار المصنفین میں ان کی کتابت و طباعت کا نظم نہ ہو سکے تو باہر سے ان کی طبع و اشاعت کا سامان کیا جائے، مگر کتابوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ دار المصنفین یک بارگی ان کے اخراجات کا متکفل نہیں ہو سکتا اس لئے اس کی ایک اپیل اپنے ساتھ لایا ہوں جب احمد سعید صاحب کو اسے اور دار المصنفینؒ کا تعارف دیا تو انہوں نے اسے ایک اچھے خاصے مضمون کی صورت دے کر ازراہ کرم اپنے اخبار میں شائع کر دیا، جس کو بعض دوسرے اخباروں نے بھی نقل کیا، ڈاکٹر صاحب نے مولانا عبد السلام ندویؒ کی انقلاب الامم کو اپنی پسندیدہ کتاب قرار دیتے ہوئے اس کی اشاعت کی ذمہ داری قبول فرمائی، میں نے عرض کی کہ یہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو بھی بہت پسند تھی۔ اس سلسلہ کا آغاز علامہ شبلی مرحوم کی حقیقی پوتی ڈاکٹر نسیم جہاں صاحبہ کے گراں قدر عطیہ سے ہوا تھا جس سے الحمدللہ سیرۃ النبیؐ جلد اول ضروری تصحیح کے بعد اشاریے اور انڈکس کے ساتھ اہتمام سے چھپ گئی ہے اور اب دوسری جلد کی طباعت کا سامان کیا جا رہا ہے، اگر مولانا شبلی اور دار المصنفین کے قدرداں اصحاب خیر اس کی جانب توجہ فرمائیں تو یہ مشکل کام آسان ہو سکتا ہے۔

کلکتہ کے مشہور اور ہر دل عزیز شخص اور دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے معزز رکن جسٹس خواجہ محمد یوسف سے فون پر رابطہ قائم ہوا تو وہ بھی ملاقات کے لئے تشریف لائے اور ایران سوسائٹی میں عصرانے پر مدعو کر کے اس کے ذمہ داروں اور کارکنوں سے ملاقات کا انتظام بھی کرا دیا۔ حاجی منظور علی صاحب دار المصنفین کے عاشقوں میں ہیں، مگر کلکتہ سے باہر ہونے کی وجہ سے ان کی ملاقات سے محروم رہا، حاجی عبد القیوم صاحب سے بھی نہ ملنے کا بڑا افسوس ہے، حاجی منصور علی صاحب سے جلسے میں ملاقات ہوئی مگر تشنگی باقی رہی، انجمن مفید الاسلام کے رکن رکین جناب اسحاق صاحب سے انجمن جانے کا پروگرام طے ہوا تھا مگر وقت پر ان کے تشریف نہ لانے کی وجہ سے کلکتہ کے بزرگ عالم و طبیب مولانا حکیم زماں حسینی صاحب کی عیادت و ملاقات کے لئے چلا گیا، جناب عبد العزیز صاحب برابر ملتے رہے، وہ کلکتہ کی جماعت اسلامی کے امیر اور مسلم مجلس مشاورت بنگال کے سکریٹری اور قومی

ولی کاموں میں ڈاکٹر مقبول احمد صاحب کے دست راست ہیں۔

ملت ایجوکیشنل ٹرسٹ مغربی بنگال اور مسلم وومین ایسوسی ایشن کے تعاون سے مسلم انسٹی ٹیوٹ آڈیٹوریم میں ڈاکٹر مقبول احمد صاحب کی صدارت میں ۱۴/ جولائی کو مغرب بعد میں نے مقالہ پڑھا، ڈاکٹر صاحب ملت ایجوکیشنل ٹرسٹ کے صدر اور عبدالعزیز صاحب سکریٹری ہیں۔ ٹرسٹ کے شعبہ خواتین کی صدر ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ خاشعہ صاحبہ اور سکریٹری نورجہاں شکیل صاحبہ اور صبوحی عزیز صاحبہ ہیں۔ ان سب نے بڑے حوصلے سے جلسہ کا اہتمام کیا تھا مگر اسی روز کلکتہ میں وزیر اعظم صاحب کے تشریف لانے اور شام کو بارش ہوجانے سے حاضرین کی تعداد زیادہ نہیں رہی، تاہم منتخب اور تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے جب "اسلام اور تعلیم نسواں" کے عنوان سے مقالہ پڑھا گیا تو پسند کیا گیا جو انشاء اللہ آزاد ہند یا معارف میں شائع ہوگا۔ اسلامک ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری قاسم منشی صاحب کلکتہ سے کافی دور ۲۴ پرگنہ چکر بیریا سے جلسہ میں شرکت کے لئے آئے تھے، انہوں نے انگریزی میں کہا کہ میں اردو نہیں جانتا کیسے مقالہ سے فائدہ اٹھا سکوں گا ع زبان یار من ترکی و من ترکی نمیدانم، ان کے اور بعض دوسرے حضرات کے خیال سے ڈاکٹر صاحب کو مقالہ کا خلاصہ انگریزی میں پیش کرنے کی زحمت اٹھانی پڑی۔ انہوں نے اور ان کی اہلیہ نے کلکتہ کے ہفت روزہ قیام میں میری میزبانی اور عزت افزائی کر کے مجھے اپنا بہت زیربار احسان کیا، ان کے ملازمین نے بھی بڑا آرام پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے!

کلکتہ ہی سے ۱۷ و ۱۸/ جولائی کو ہونے والے ندوۃ العلما اور مجلس تحقیقات و نشریات کے جلسوں میں شرکت کے لئے لکھنؤ پہنچا، ندوہ کے جلسہ انتظامیہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا، صلیبی حملہ اور تاتاری یورش سے بڑھ کر عہد حاضر کا یہ فتنہ ہے کہ اسلام ایک فرسودہ اور بے جان مذہب ہے، اس میں عہد حاضر کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں، یورپ و امریکہ کی پوری قوت اور اسرائیل کی ساری ذہانت و شطارت اس پر صرف ہورہی ہے کہ عالم اسلام یہاں تک کہ حرمین شریفین بھی اس سازش کا شکار ہوجائیں، اور مسلم تعلیم یافتہ اور حکمراں طبقہ یہ باور کرلے کہ سیکولرازم اور نیشنلزم کے علاوہ ترقی کا کوئی اور راستہ نہیں ہے، مولانا نے مدارس دینیہ کو اس فتنہ و سازش سے واقف ہو کر اس کے مقابلہ کے لئے کمربستہ ہوجانے کی دعوت دی۔

ناظرین کو اخباروں سے مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کی وفات کی خبر ملی ہوگی، قاضی صاحب پر اسی شمارہ میں مضمون شامل ہے اور آئندہ شمارہ میں فاروقی صاحب پر مضمون شامل ہوگا۔

مقالات

استشراق اور اس کے محرکات و مکاتب فکر

از جناب سید علیم اشرف جائسی۔ لیبیا۔

استشراق، مشرق کے خلاف عموماً اور عالم اسلام کے خلاف خصوصاً مغربی سازشوں کے مثلث کا ایک زاویہ ہے، مکر و فریب کے اس مغربی تکونے کے دوسرے دو زاویے تبشیر اور استعمار ہیں، لیکن استشراق اپنے طویل اور دوررس اثرات کی بنا پر اس مثلث کا سب سے خطرناک زاویہ ہے۔

اگرچہ مستشرقین اور ان کے مشرقی ہمنوا جو مستغربین بھی کہلاتے ہیں کا اصرار ہے کہ استشراق ایک خالص علمی تحریک ہے اور دنیائے مشرق پر اس کے گراں قدر احسانات ہیں، مگر مستشرقین کا یہ دعویٰ خلاف واقعہ اور تاریخی حقائق کی نفی کرتا ہے، ان کے جو مشرقی ہمنوا ان کی لے میں لے ملاتے ہیں وہ اس بنا پر کہ مغربی تہذیب نے ان کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے۔

استشراق کے ظہور اور نشو و ارتقا میں علمی تحرک کا اعتراف ہم کو بھی ہے مگر اس کی حیثیت ثانوی درجے کی ہے، یہاں استشراق کے اہم محرکات کا ایک جائزہ لینا ناموزوں نہ ہوگا، کیونکہ ان کی معرفت استشراق کے مطالعے اور اس کے مقاصد کے تعیین میں ممد و معاون ہوگی۔ اہم محرکات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دینی محرک | یہ استشراق کے ظہور و ارتقا کا سب سے قوی محرک ہے، جس کی

تصدیق متعدد تاریخی شواہد سے ہوتی ہے۔

الف۔ اس پر مفکرین و محققین کا اتفاق ہے کہ استشراق کا آغاز کلیساؤں سے ہوا۔

ب۔ کاروان استشراق کے اولین مسافروں کا تعلق براہ راست کلیساؤں سے تھا، جیسے فرانسیسی راہب جربرٹ جو ۹۹۹ء میں ویٹیکن کا سربراہ بنا، سلفسٹر دوئم، بطرس محترم ۱۱۵۶ء، جیرار ڈکریمونی ۱۱۸۹ء، ریجولڈ ۱۳۲۰ء، اور یوحنا شقوبی ۱۴۵۶ء وغیرہ۔

ج۔ مشرقی علوم سے متعلق مغرب کے بیشتر علمی و ثقافتی ادارے پادریوں اور راہبوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں جیسے "مشرقی زبانوں کی تعلیم کا ادارہ" جسے بابا ہونو ریوس چہارم نے ۱۲۸۵ء میں فرانس میں قایم کیا، "سوربون یونیورسٹی" جسے مشہور فرانسیسی پادری روبیر دی سوربو نے قایم کیا اور اس کی تجدید بھی ایک پادری ریشیلیو کے ہاتھوں ۱۶۲۶ء میں ہوئی، اسپین کا "دفتر مترجمین" جسے طلیطلہ کے اسقف اعظم ریمونڈ اول نے ۱۱۳۰ء میں قایم کیا، روم کا "مارونی کالج" جس کا قیام بابا گریگوریس کی کوشش سے ۱۵۸۴ء میں عمل میں آیا اور اٹلی ہی کے ایک شہر فلورنسا کا "مدرسہ برائے مشرقی زبان" جس کی بنا ۱۹۲۳ء میں کارڈینال ڈی میڈیچی نے ڈالی، ایسے ہی اور بہت سے ادارے، مدرسے، کتب خانے، مطابع اور جامعات جو پادریوں اور راہبوں کی کوششوں کے مرہون منت ہیں۔

د۔ استشراق کا قدیم ادب و لٹریچر بھی اس محرک کے وجود کی ایک بہترین دلیل ہے جس کا سرسری مطالعہ اس دعوی کو یقین میں تبدیل کرنے کے لیے

کافی ہے۔

ھ۔ مستشرقین اور مبشرین کے درمیان گہرے روابط اور افادہ و استفادہ پر مبنی تعلقات بھی استشراق کے دینی محرک کی غمازی کرتے ہیں۔

و۔ خود بعض مستشرقین نے دینی محرک کے وجود کا اعتراف کیا ہے۔

۱.۲ استعماری محرک یہ محرک دو عصروں میں منقسم ہے: ۱۔ عملی استعمار سے پہلے کا عصر جسے ہم استعمار کی فکری اور عسکری تیاریوں کا عصر کہہ سکتے ہیں اور ۲۔ عملی استعمار کا عصر۔ ان دونوں عصروں میں استشراق کے اس محرک کی موجودگی کے وافر ثبوت اور دلائل پائے جاتے ہیں مثلاً:

الف۔ عملی استعمار سے قبل مستشرقین نے مشرقی ملکوں کے جو علمی سفر کیے ان کے نتائج کو استعماری مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا بلکہ بعض کا سفر تو استعماری قوتوں کے اشاروں پر ہی ہوا، جس کی بہترین مثال کتاب "ہیمفرے کے اعترافات" ہے، ایسے ہی ۱۷۹۸ء میں نیپولین کے مصر پر حملے کا محرک بھی فرانسیسی مستشرق کانٹ ڈی دولنی کا مصر کا سفرنامہ تھا۔

ب۔ استعماری طرز و رنگ اور خوبو والا استشراقی ادب۔

ج۔ بعض مستشرقین کا یہ اعتراف کہ انھوں نے اور ان کے بہت سے ساتھیوں نے استعماری طاقتوں کے لیے کام کیا، جیسے مشہور مستشرق مارٹینی نے ایک انٹرویو میں اعتراف کیا کہ "عملی استعمار کے عصر میں بیشتر مستشرقین اس کے ساتھ مکمل طور پر وابستہ تھے۔" (رسالہ "الموقف الادبی" عدد ۱۲۲، ۱۹۸۱ء)

د۔ کئی مستشرقین نے استعماری فوجوں کے اعلیٰ مناصب پر کام کیا، جیسے:

واٹسن اور ریچرڈ وغیرہ۔

ھ۔ مغربی نوآبادکاروں نے مشرقی اقوام کے سلسلے میں اپنی حکمت عملی طے کرنے کے لیے استشراقی آداب اور مطالعات و تحقیقات کا سہارا لیا، جیسے برطانوی استعمار کی مشہور پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" دراصل استشراق کے فرقہ وارانہ مطالعات سے ماخوذ ہے۔

و۔ نوآبادکاروں نے استشراق کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی کیونکہ انھیں اپنی نوآبادیوں کے دینی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات کو سمجھنے کے لیے اس کی ضرورت تھی جس کے بغیر نہ تو نوآبادیوں پر گرفت رکھی جاسکتی تھی اور نہ ہی ان کے حدود میں توسیع ممکن تھی، اس سلسلے میں ولیم میور، کرومر، اسنوک ہرگرونج، گلگٹ، واٹسن اور لارنس وغیرہ سیکڑوں مستشرقین کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں جنھوں نے مختلف شعبوں میں استعمار کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

۳۔ نفسیاتی محرک: اس محرک کا تعلق انسان کے فطری تقاضوں سے ہے۔ ہر انسان میں خواہ وہ کہیں کا رہنے والا ہو یہ جذبہ موجود ہوتا ہے۔ اس محرک کے مختلف مظاہر ہیں۔

ا۔ سفر و سیاحت کی خواہش۔

ب۔ دوسری قوموں کے احوال جاننے میں رغبت۔

ج۔ مادی فوائد کے حصول کا جذبہ۔

د۔ اپنے معتقدات اور نظریات میں دوسروں کو شریک کرنے کی آرزو۔

۴۔ اقتصادی محرک: لبنانی نژاد اور معاصر امریکی مفکر "ایڈورڈ سعید" جو بین الاقوامی

شہرت کے انگریزی ادیب و ناقد اور ماہر استشراقیات ہیں کی رائے ہے کہ استشراق کے ابتدائی دور میں دینی محرک کی جو حیثیت تھی وہی حیثیت آخری دور میں اقتصادی محرک کو حاصل ہوگئی باقی دوسرے محرکات ضمنی حیثیت کے تھے۔

ایڈورڈ سعید کی رائے سے اس حد تک تو ہمیں اتفاق ہے کہ استشراق کے محرکات میں اقتصادی محرک بھی ہے لیکن دوسرے محرکات کو ضمنی قرار دینے کی بات محل نظر ہے۔

۵۔ سیاسی محرک: دوسری جنگ عظیم کے بعد بعض سیاسی اور سماجی حالات کی بنا پر مغرب کے لیے اپنی نوآبادیات کو باقی رکھنا ممکن نہیں رہا، یا پھر ذرائع ابلاغ اور وسائل نقل و حمل کی ترقی نے براہ راست استعمار کو غیر ضروری بنا دیا۔ جب ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں کی "آزادی" کے بعد مغربی ملکوں سے ان کے سفارتی تعلقات قائم ہوئے تو مغرب نے ان ملکوں میں قائم اپنے سفارت خانوں، کونسلز اور سیاسی اداروں کو مستشرقین کے حوالے کر دیا جنھوں نے اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دیا جو مغربی ملکوں نے انھیں سپرد کی تھی چنانچہ نصف صدی بعد بھی مشرق میں موجود سیاسی عدم استقرار، خوں ریزی، دہشت گردی، فرقہ واریت اور جاسوسی و تخریب کاری کے بیشتر واقعات میں براہ راست یا بالواسطہ یہ مغربی سفارت خانے ملوث ہوتے ہیں اور بعض ملکوں میں تو یہ سفارت خانے اس قدر طاقتور اور با اختیار ہیں کہ وہ ہمیں نوآبادیاتی دور کی ریزیڈنسیوں کی یاد دلاتے ہیں۔

۶۔ علمی محرک: مستشرقین کی ایک مختصر سی جماعت نے مشرقی علوم و آثار کے مطالعہ و تحقیق کو خالص علمی بنیادوں پر اختیار کیا ہے اور انسانی علوم و معارف کی قابل ستائش خدمت کی، جیسے کارلائل، اتیان دی نے، مارشل بوداژ، جرگاؤ دے وغیرہ۔

استشراق کے مطالعہ کے لیے اس کے محرکات کی طرح اس کے مختلف مکاتب فکر اور ان کی نمایاں خد و خال اور خصوصیات کو جاننا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر استشراق کے عمق فکر تک پہونچنا اور اس کے مختلف ابعاد کا احاطہ کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ دراصل اس کے خد و خال اور خصوصیات کے پس پشت مختلف قسم کے دینی، تاریخی، سماجی اور سیاسی عوامل کارفرما ہیں جن کے تجزیہ کے لیے خود ایک مستقل مضمون درکار ہے۔ یہاں ہم استشراق کے اہم اسکولوں اور ان کے نمایاں خد و خال کا جائزہ لیں گے۔

ا۔ برطانوی اسکول مشرق سے جزیرہ برطانیہ کا تعلق خاصہ قدیم ہے۔ ظہور اسلام سے قبل بھی اس تعلق کا سراغ ملتا ہے لیکن مشرق کے بارے میں ہمارے علم کے مطابق پہلی برطانوی تصنیف برطانوی سیاح دیلی بالڈ کا وہ سفرنامہ ہے جو اس نے پہلی صدی ہجری میں عرب ممالک کی سیاحت کے بعد مرتب کیا تھا۔

استشراق کے برطانوی اسکول کے نمایاں خد و خال مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس اسکول کی ابتدا خالص ذاتی نوعیت کے مقاصد سے ہوئی جن میں سب سے اہم مقصد اندلس اور صقلیہ (سسلی) کے مسلم علماء سے عربی زبان اور فلسفہ کا حصول تھا تشنگان علم اپنی پیاس بجھانے کے لیے اندلس جاتے تھے، برطانوی حکومت بھی طلبہ کے وفود روانہ کرتی تھی ان میں سے ایک وفد کی سربراہی شہزادی ڈوبان نے بھی کی تھی جو پرنس آف ویلز کی لڑکی تھی۔

۲۔ تبشیری اور استعماری مقاصد نے برطانوی استشراق کو نیا جوش و خروش دیا۔

۳۔ مسلمانوں سے متعلق اس اسکول کی توجہ مسلمانوں کی زبانوں اور ان سے متعلق

علوم پر ہی رہی۔

۴۔ ہندوستان اور اسلامی ممالک خصوصیت سے مصر اس کا محور رہے۔

۵۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں اس اسکول کی نشو و نما ہوئی۔

۶۔ اس کے ارکان نے برطانوی وزارت خارجہ اور نوآبادیات میں فوجی اور سفارتی خدمات انجام دیں اور مشیروں کی حیثیت سے کام کیا جیسے: رچرڈ اور داشن وغیرہ۔

۷۔ گذشتہ صدی سے اس نے اسلامیات میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دیا اور عرب ملکوں میں پٹرول نکلنے کے بعد اس دلچسپی میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

۸۔ اس کے بعض اعضاء عربی اکیڈمیوں کے ممبر رہے جیسے نیکولسن وغیرہ اور بعض نے مشرقی مدارس و جامعات میں علوم شرقیہ کی تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیے جیسے: اسپرنگر جس نے اسلامک کالج دہلی کے سربراہ اور فورٹ ولیم کالج کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کیا اور آرنلڈ مسلم یونیورسٹی اور لاہور کالج میں صدر شعبۂ فلسفہ رہے۔

۹۔ رواں صدی کے نصف آخر میں اس کے دائرہ کار میں نمایاں وسعت آئی ہے، متعدد برطانوی یونیورسٹیوں میں شعبۂ استشراق قائم ہوا ہے اور علوم شرقیہ سے متعلق تعلیمی اداروں، کتب خانوں اور مطابع کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

ب۔ امریکی اسکول اس کے خد و خال بھی برطانوی اسکول جیسے ہیں، البتہ موجودہ صدی کے نصف آخر سے امریکی اسکول کی مستقل شناخت بنتی جا رہی ہے جس کے متعدد اسباب ہیں۔

۱۔ غیر معمولی مادی وسائل اور برطانیہ پر کئی گنا فوقیت رکھنے والے ذرائع ابلاغ نے امریکی استشراق کو نئی جہتیں عطا کیں۔

۲۔ عالم اسلام میں امریکہ کی دلچسپیوں میں اضافہ اور عرب اسرائیل تنازعے میں اس کا کردار۔

۳۔ امریکی زندگی کے مختلف گوشوں پر صہیونی اثرات۔

۴۔ سرد جنگ کے دوران کمیونسٹ اثرات کے مقابلے کے لیے امریکہ کے سیاسی اور عسکری تعلقات اور مصالح دنیا کے سارے ملکوں سے وابستہ ہوگئے، جن کی حفاظت کے لیے امریکی استشراق بھی زیادہ فعال، متنوع اور وسیع ہوگیا۔

۵۔ امریکی تعلیمی اداروں میں آنے والے دنیا بھر کے طلبہ نے بھی اس اسکول کو موضوعی اور جغرافیائی دونوں اعتبار سے متنوع بنادیا ہے۔

ج۔ جرمنی اسکول مشرق سے جرمنی کا تعلق دسویں صدی عیسوی سے شروع ہوا جبکہ اس کے شہنشاہ نے ۹۵۶ء میں یوحنا نام کے ایک پادری کو اپنا سفیر بنا کر خلیفہ الناصر کے پاس بھیجا تھا اور کرائسمان پہلا جرمنی فاضل ہے جو مستشرق کی حیثیت سے مشہور ہوا، علوم شرقیہ کی خدمات کے اعتبار سے یہ استشراق کا سب سے اہم مدرسہ ہے، اس کے بعض خدوخال حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس اسکول کے مستشرقین فنافی العمل، غیر معمولی صبر وریاضت اور طویل … کارگذاریوں کے لیے معروف ہیں، وستنفلڈ نے تحقیق و مطالعے میں اپنی بصارت گنوادی اور یوہان رائیسکے نے اپنی ساری زندگی عربی زبان وادب کے لیے وقف کردی اور شہید ادب عربی کے نام سے مشہور ہوا اور بروکلمان نے اپنی عمر … کتاب "تاریخ ادب عربی" کی ترتیب وتصنیف میں نصف صدی صرف کردی۔

۲۔ عمل کی ضخامت بھی اس اسکول کی نمایاں خصوصیت ہے، بقول البنی …

متعدد جرمن مستشرقین کی کارگذاریوں کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک مستقل اکیڈمی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳۔ اٹھارہویں صدی سے قبل اس کی کارگذاری کا کوئی قابل ذکر نمونہ نہیں ملتا ہے،

۴۔ مخطوطات کی تحقیق واشاعت اور ان کی فہارس کی ترتیب وتدوین میں اس اسکول کو امتیازی شان حاصل ہے، جس کا مقابلہ کوئی بھی دوسرا اسکول نہیں کرسکتا۔

۵۔ عربی لغات کی تحقیق واشاعت میں بھی اس نے نسبتاً زیادہ اہم کام کیا ہے۔

۶۔ اس اسکول کے بعض مستشرقین نے مشرق کی جامعات میں تدریسی خدمت انجام دی اور کئی ایک عربی اکیڈمیوں کے ممبر رہے۔

۷۔ مشرقی آثار میں اس اسکول کی دلچسپیاں سب سے نمایاں رہیں اور اس سلسلے میں جرمنی نے بہت سے مشرقی ملکوں میں علمی وتحقیقی ادارے قائم کیے۔

۸۔ اس اسکول کا دائرہ کار عربی زبان اور اسلامی علوم تک ہی محدود رہا۔ صرف چند افراد ہی اس دائرے سے باہر نکلے، جنھوں نے سنسکرت زبان اور ہندوستانی فلسفے کو اپنا موضوع بنایا۔

۹۔ جرمن زندگی کے تمام شعبوں کی طرح یہ بھی نازی تحریک سے متاثر ہوا۔

۱۰۔ اس اسکول میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کے جذبات سب سے کم ملتے ہیں۔

د۔ اطالوی اسکول مشرق سے اپنے قدیم ترین تعلقات کی بنیاد پر پورے یورپ میں اٹلی کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، اور یہ تعلقات قبل مسیح سے قائم ہیں، اس کے متعدد

اسباب ہیں جیسے: جغرافیائی قربت، شمالی افریقہ اور بلاد شام میں طویل عرصے تک قائم رومی حکومت، بحیرہ روم سے ہونے والی مشرق و مغرب کی تجارت میں اطالوی بندرگاہوں کا کردار، عربوں کی صقلیہ میں حکومت اور ویٹیکن کا اٹلی میں وجود وغیرہ اس اسکول کے اہم خدوخال و علامتیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱-۱ اس کے ظہور و ارتقا میں ویٹیکن کا بنیادی حصہ رہا ہے۔

۲-۱ اس کا اولین محرک خالص دینی نوعیت کا تھا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اٹلی میں علوم شرقیہ کے تمام ادارے اور مراکز راہبوں اور پادریوں کی کوشش سے قائم ہوئے جیسے "روم کا مارونی کالج" جسے پاپائے روم گرگوریس نے ۱۵۸۴ء میں قائم کیا اور فلورنسا کا "مشرقی زبانوں کا اسکول" جس کی بنیاد ۱۹۲۳ء میں کارڈینال ڈی میڈیچی نے رکھی۔

۳- عام طور پر اسلام اور مسلمانوں اور خصوصیت سے عربوں اور عربی زبان پر اس کی توجہ مرکوز رہی، کایتانی، نلینو، جویدی اور میکانجلو جیسے مشاہیر اطالوی مستشرقین کی تحریریں اس کا ثبوت ہیں۔

۴- اس اسکول کے بعض افراد بیک وقت ایک سے زیادہ عربی اکیڈمیوں کے ممبر رہے جیسے نلینو اور فرانشسکو اور بہت سے دوسروں نے عرب کی یونیورسٹیوں میں درس و تدریس کا کام کیا اور ان سے متعدد عرب مشاہیر نے تعلیم حاصل کی جیسے مشہور عربی ادیب و ناقد طہ حسین نے نلینو سے تعلیم پائی جس کی گہری چھاپ ان کے فکر و ادب میں ملتی ہے۔

۵-۱ اس اسکول کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خواتین نے

بڑی مقدار میں شرکت کی جیسے ماریا نلینو اور انجیلا وغیرہ۔

۶- علمی وراثت بھی اس اسکول کی خاص علامت ہے جیسے: جویدی اور اس کا بیٹا میکانجلو، گبریلے اور اس کا بیٹا فرانشیسکو اور نلینو اور اس کی بیٹی ماریا وغیرہ۔

ھ- فرانسیسی اسکول | فرانس میں استشراق کے ظہور کے متعدد اسباب تھے جیسے: اندلس میں اسلامی حکومت کا قیام (۷۱۱-۱۴۹۲ء) جنوبی فرانس کے بعض علاقوں پر مسلمانوں کا تسلط، اندلس میں انفرادی اور اجتماعی طور پر فرانسیسی طلبہ کا حصول علم کے لیے آمد و رفت۔ ایک علمی وفد میں شہنشاہ لوئس ششم کی خالہ زاد بہن شہزادی الزابتھ بھی شریک تھی، صلیبی جنگوں میں فرانس کی پرجوش شرکت، تبشیری اعمال میں اس کی دلچسپی، نپولین کا مصر پر حملہ (۱۷۹۸ء) اور بہت سے اسلامی اور مشرقی ملکوں میں فرانسیسی استعمار اور نوآبادیوں کا قیام وغیرہ ہیں، فرانس کے استشراقی اسکول کے نمایاں خدوخال میں سے بعض مندرجہ ذیل ہیں:

۱-۱ اس کی سرگرمیوں کے بنیادی طور پر تین محور ہیں۔

ا- دینی محور۔ ب- سیاسی محور۔ ج استعماری محور

۲- ۱۷۹۵ء میں قائم ہونے والے مشرقی زبانوں کا انسٹیٹیوشن اور سوربون یونیورسٹی نے اس اسکول کو فعال اور متحرک بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

۳- اس اسکول کے آغاز میں بھی راہبوں اور پادریوں کا نمایاں کردار تھا اور اس کے بیشتر قدیم ادارے پادریوں کے ہی مرہون منت تھے اور انہیں کی سرپرستی میں چلتے تھے۔

۴-۱ اس اسکول کی سب سے امتیازی خصوصیت عرب ملکوں کے غیر عربوں کی

زبان اوران کی تہذیب و ثقافت کا وسیع مطالعہ ہے جو اس کی بدنیتی کا غماز ہے۔

اس سلسلے میں متعلقہ قوموں اور جماعتوں کے بارے میں فرانسیسی مستشرقین کے مقالے، رسائل اور کتابیں یورپ کے نزدیک اولین مصادر کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے:

ا۔ رسالہ "مخطوطات بربر" (۱۹۱۵۔ ۱۹۲۰ء)

ب۔ کتاب "قبطی اور بربر ادیان کا مطالعہ"

ج۔ کتاب "طوارق اور بربر لہجوں کا مطالعہ"

د۔ مقالہ "بربر، اسلام اور فرانس" وغیرہ۔

بربر طوارق اور اقباط کی طرح دروز، ارمن اور اکراد وغیرہ پر بھی مختلف مضامین اور کتابیں اس اسکول کی طرف سے شایع ہوئیں۔

۵۔ اس اسکول نے فرانسیسی نوآبادیوں کی تہذیب و ثقافت اور نظام تعلیم اور زبان پر گہرے اثرات ڈالے جس کی مثال کسی بھی دوسرے اسکول میں نہیں ملتی۔

۶۔ استعمار کے وقت میں متعدد فرانسیسی مستشرقین نے فرانسیسی فوج اور اس کی نوآبادیوں میں اعلیٰ عہدوں پر کام کیا اور استعمار کے خاتمے کے بعد اہم ترین سیاسی اور سفارتی خدمات انجام دیں۔

۷۔ اس کے افراد کا موضوعاتی تخصص بھی اس اسکول کی ایک خصوصیت ہے۔

۸۔ مشرقی ملکوں خاص کر اپنی نوآبادیوں میں بہت سے اسکول، مدارس اور ثقافتی مراکز قائم کیے جیسے:

ا۔ "انسٹیٹیوٹ برائے مطالعہ شمالی مراقش" ۱۹۴۱ء میں قائم ہوا۔

ب۔ مصر کا "فرانسیسی علمی انسٹیٹیوٹ" ۱۷۹۸ء میں نیپولین نے قایم کیا۔

ج۔ قاہرہ کا فرانسیسی مرکز برائے مشرقی آثار" ۱۷۹۸ء میں قایم ہوا۔

د۔ دمشق اور تہران کے فرانسیسی ثقافتی مراکز۔

ھ۔ تیونس کا "انسٹیٹیوٹ برائے عربی ادب" ۱۸۴۱ء میں قائم ہوا۔

و۔ الجزائر کا "مدرسہ برائے ادب عالیہ" ۱۸۸۱ء میں بنایا گیا۔

۹۔ روسی اسکول: اگرچہ سابق سوویت یونین اور موجودہ وفاقی روس کا بیشتر حصہ مشرق میں واقع ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کا شمار استشراق مدارس میں ہوتا ہے جس کے منطقی اسباب یہ ہیں:

۱۔ سوویت یونین یا موجودہ روس مشرق کے لیے اپنے مقاصد، خواہشات، عزائم اور سیاسی نقطہ نظر میں دوسرے مغربی ملکوں جیسا ہی تھا اور ہے۔

۲۔ علوم شرقیہ سے وابستہ روسی محققین و مصنفین اپنی فکر اور طریقہ کار میں عام مستشرقین سے مختلف نہیں ہیں۔

۳۔ سابق یونین ہو یا موجودہ وفاق دونوں میں حاکم طبقہ کا تعلق یوروپی حصہ سے تھا اور ہے۔

۴۔ سوویت یونین کے مارکسی اور الحادی نظریات مذہبی قدروں میں یقین رکھنے والے مشرق کے لیے مسیحی استشراق سے بڑا خطرہ تھے اور ہیں۔

مشرقی ملکوں خاص کر عالم اسلام سے روس کے ابتدائی تعلقات کی نشاندہی بارہویں صدی عیسوی میں ہوتی ہے جب روسی زائرین نے بیت المقدس کے سفر زیارت کے حالات پر کتابیں لکھیں جن میں پادری دانیال کے سفر نامے ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۸ء نے بڑی شہرت حاصل کی۔

واضح رہے کہ یہاں روسی اسکول کے جن خدوخال اور خصوصیات کا ذکر کیا جائے گا ان کا تعلق سابق روسی صدر گورباچوف کے ذریعہ "پرسترائیکا" کے اعلان کی تاریخ (۱۵ جولائی ۱۹۸۸ء) سے پہلے کے روس سے ہے، بلاشبہ ستر سال سے آگ اور فولاد کی قوت سے نافذ اس فاسد اور ناپاک نظام کا خاتمہ روسی زندگی کے تمام گوشوں کو متاثر کرے گا اور لازمی طور پر روسی استشراق کی صورت کیا ہوگی اسے مستقبل کو طے کرنا ہے لیکن اشتراکیت سے سرمایہ داری اور مغربی قدروں کی طرف روس کی موجودہ اندھی دوڑ کو دیکھتے ہوئے اس میں کسی مثبت تبدیلی کی توقع عبث ہوگی بلکہ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ مستقبل میں روسی اسکول مارکسی الحاد و فساد اور مغربی مکر و فریب دونوں کا مجموعہ ہو جائے گا۔

اس اسکول کے کچھ اہم خدوخال یوں ہیں:

۱۔ علوم شرقیہ میں اس کی دلچسپیاں قدیم ہیں لیکن باقاعدہ ایک اسکول کی حیثیت سے اس کا وجود انیسویں صدی سے قبل نہیں ملتا ہے۔

۲۔ بالشویک انقلاب کے بعد مشرقی زبانوں کے مطالعے کا آغاز ہوا۔ ۱۹۱۷ء-۱۹۸۸ء تک یعنی مارکسی عہد میں دوسرے علوم کے مقابلے میں زبانوں پر اس کی توجہ زیادہ رہی جیسے ترکی، چینی، منگولی، فارسی، عربی اور سنسکرت وغیرہ۔

۳۔ دوسرے نمبر پر اس کی توجہ کا مرکز مخطوطات کی تحقیق اور فہارس کی ترتیب تھا جس کا ایک بڑا ذخیرہ مقبوضہ روسی ترکستان میں موجود تھا۔

۴۔ مقبوضہ ترکستان میں مسلمانوں کے وجود نے اسے حرکت و نشاط بخشا اور وہاں کے عربی، فارسی، ترکی اور ازبکی زبانوں میں اسلامی مخطوطات کی کثرت نے

اس اسکول کو نمایاں بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور اسے موضوعاتی تنوع عطا کیا۔

۵۔ امریکہ کے ساتھ سرد جنگ کے زمانے (۱۹۴۵ء-۱۹۸۸ء) میں اس نے اسلامی علوم پر توجہ دینا شروع کیا مگر پھر بھی دوسرے مدارس کے مقابلے میں اس جانب اس کی توجہ واضح طور پر کم رہی ہے۔

۶۔ اس کے اکثر مشاہیر نے فرانسیسی مستشرق ڈی ساسی سے تعلیم و تربیت حاصل کی جو اپنی اسلام دشمنی کے لیے مشہور ہے۔

۷۔ علوم شرقیہ سے متعلق روس کے مطبعہ پیٹرس برگ نے عالمی شہرت حاصل کی۔

ن۔۱۔ اسپینی اسکول اسپین میں استشراق کے ظہور اور ارتقا کا سبب وہاں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومت (۷۱۱-۱۴۹۲ء) اور عصور وسطی کی سب سے بڑی تہذیب کا قیام ہے۔ اس کے اہم خدوخال حسب ذیل ہیں:

۱۔ اندلس کے مسلمانوں کی غیر معمولی علمی اور فکری ترقیوں نے اسپینیوں کو حد درجہ متاثر کیا اور نتیجے میں ان کے اندر عربی ادب اور اسلامی علوم کے حصول کا شوق پیدا ہوا اور یہی دونوں عموماً اس اسکول کے محور ہیں۔

۲۔ تیرہویں صدی عیسوی سے علمی محرک کی حیثیت ثانوی درجے کی ہوگئی اور اس اسکول پر دینی محرک کا غلبہ ہوگیا۔

۳۔ اسپینی کتبخانوں میں موجود اسلامی مخطوطات اور آثار کے ذخیروں نے اس اسکول کے نشوونما اور اس کی سرگرمیوں کی نوعیت کے تعین میں قابل ذکر کردار ادا کیا۔

۴۔ کتب خانہ اسکوریال عربی مخطوطات اور آثار کے اہم ترین عالمی مراکز

میں سے ہے اس اسکول کے خدوخال کی تعمیر میں اس کا بڑا دخل رہا ہے۔

۵- اس نے عربی مخطوطات کی تحقیق و اشاعت اور فہارس کی ترتیب پر خصوصی توجہ دی۔

۶- عربی کتابوں کے ترجمے میں اس کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ دوسرے موضوعات میں فلسفہ، تصوف، ادب اور تاریخ شامل ہیں۔

۷- مشہور اسپینی مستشرق گارسیا گومز کی سربراہی میں چلنے والے "ادارہ برائے عربی علوم و ثقافت" اور آسیوس بلاسوس کے قائم کردہ "مدرسہ برائے مطالعہ علوم عربی" اس اسکول کے خاص مراکز ہیں۔

مذکورہ بالا مدارس، استشراق کے اہم اور بڑے مدارس ہیں دوسرے تمام چھوٹے مدارس اپنے خدوخال اور خصوصیت کے اعتبار سے انہیں میں سے کسی ایک کے تحت داخل ہیں یا ان میں سے متعدد کے خدوخال کا مجموعہ ہیں، بعض حضرات نے استشراق کو صرف تین مدرسوں میں تقسیم کیا ہے، برطانوی، اطالوی اور فرانسیسی، ڈاکٹر نجیب عقیقی نے اس دائرے کو اور محدود کرکے استشراق کو صرف دو مدرسوں میں تقسیم کیا ہے ۱- سیاسی مدرسہ ۲- اثری مدرسہ۔ لیکن مذکورہ بالا تقسیم غالباً زیادہ واضح اور حقیقت سے قریب تر ہے۔

موسیٰ بن عقبہ اور انکی مغازی

از

جناب جمشید احمد ندوی۔ علی گڑھ

قرن اول ہی سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور حیات طیبہ سے لوگوں کو شغف رہا ہے، صحابہ کرام اپنی مجلسوں میں آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا چرچا کرتے رہتے تھے لیکن اس زمانے کا کوئی تحریری سرمایہ موجود نہیں ہے، موجودہ کتب سیرت سے اس کا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ سیرت نبوی کے تعلق سے صحابہ کرام اپنی مجلسوں میں جو کچھ ارشاد فرماتے رہے ہوں گے انہیں بعض تابعین عظام قلم بند کرلیتے رہے ہوں گے۔ گو ان تحریروں کی حیثیت مرتب کتاب جیسی نہ تھی تاہم ان کو سیرت نبوی کا اولین نقش قرار دیا جا سکتا ہے[1]۔

سیرت نبوی کے یہ ابتدائی خدوخال کبار تابعین کے مرہون منت ہیں، لیکن اولین سیرت نگار کی تعیین میں محققین مختلف الرائے ہیں، اکثر حضرات ابان بن عثمان (م ۱۰۵ھ) کو اور بعض حضرات عروہ بن زبیر (م ۹۴ھ) کو اولین سیرت نگار قرار دیتے ہیں[2] جبکہ فواد سیزگین نے مشہور صحابی سعد بن عبادہ خزرجی کے صاحبزادے سعید بن سعد بن عبادہ کو اولین سیرت نگار قرار دیا ہے اور ان چار حضرات کا نام بھی بحیثیت سیرت نگار لیا ہے، سہل بن ابی خیثمہ، سعید بن مسیب (م ۹۴ھ) عبید اللہ بن

کعب (م ۹۷ھ) اور عامر بن شراحیل شعبی[3] (م ۱۰۳ھ)۔

سیرت نبوی کے اس سرمایے اور مجموعہ روایات کو جو تحریری شکل میں ہونے کے باوجود عرصہ دراز تک مرتب و مدون نہ تھا، عصر حاضر کے بعض مورخین سیرت نگاری کا نام دینا صحیح نہیں سمجھتے کیونکہ ان میں کسی خاص موضوع کا التزام کیے بغیر مجرد روایات جمع کر دی گئی تھیں جن میں ضمناً سیرت نبوی کے بعض پہلو بھی آ گئے ہیں۔

اس بحث سے قطع نظر کہ اولین سیرت نگار کون تھا اور کن لوگوں کی کتابیں سیرت نگاری کے ضمن میں آتی ہیں، یہ امر مسلم ہے کہ اس فن کی ابتدا مدینہ منورہ میں ہوئی اور اس کے نمو و ارتقا میں امام زہری (م ۱۲۴ھ) کا خاص حصہ رہا ہے، جن کے دو نامور شاگردوں موسیٰ بن عقبہ (م ۱۴۱ھ) اور محمد بن اسحاق (م ۱۵۱ھ) نے سیرت نگاری کو ایک مستقل فنی شکل دی، اس مضمون میں پہلے ہم موسیٰ بن عقبہ کے کسی قدر حالات جو تلاش و تفحص سے ملے ہیں درج کریں گے پھر ان کی مغازی کا جائزہ لیں گے۔

افسوس ہے کہ اولین اور اہم سیرت نگار ہونے کے باوجود موسیٰ بن عقبہ کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں، جوزف ہورووتس نے ظن و تخمین سے ان کا سن ولادت ۵۵ھ قرار دیا ہے[4]۔ ان کے والد کا نام بھی معلوم نہیں ہو سکا، البتہ ان کی والدہ ابو حبیبہ مولیٰ زبیر کی صاحبزادی تھیں[5]۔ موسیٰ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے، مسجد نبوی میں ان کا حلقہ درس بھی تھا اور وہ حدیث و مغازی کا درس اور فتویٰ دیا کرتے تھے[6]۔ امام ذہبی سے مروی ایک روایت "غزوت الروم فی الولید بن عبد الملک مع سالم بن عبد اللہ"[7] سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صاحبین کی طرح صاحب سیف و سنان بھی تھے۔ اس امتیاز میں شاید ہی اس زمانہ میں کوئی ان

کا شریک و سہیم رہا ہو، جوزف ہورووتس لکھتے ہیں کہ "ہمیں موسیٰ کی ذاتی زندگی کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں، بظاہر وہ اموی دربار سے الگ تھلگ رہے اور زوال بنو امیہ کے تقریباً دس سال بعد ۱۴۱ھ میں انتقال کیا"[8]۔

اساتذہ

موسیٰ بن عقبہ کی تحصیل علم و فن اور درس و تدریس کا حال بھی نہیں ملتا، امام ذہبی کے اس قول "طلب موسی العلم وهو كهل"[9] سے ان کے شوق علم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تلاش و جستجو سے موسیٰ کے جن اساتذہ کے نام معلوم ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

محمد بن ابی بکر ثقفی، محمد بن عمرو بن عطاء، اسحاق بن یحییٰ بن ولید، حکیم بن ابی حمزۃ، سعید بن عبد الرحمن زرقی، عبد اللہ بن علی بن ہران، عبد اللہ بن فضل بن ربیعہ، ام خالد، یحییٰ بن عباد بن عبد اللہ، ان کے نانا ابو حبیبہ، سالم و حمزۃ بن عبد اللہ بن عمر، اعرج، نافع بن جبیر، ابو سلمہ بن عبد الرحمن، نافع مولیٰ ابن عمر، کریب، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، محمد بن سکندر، عروۃ بن زبیر، عبد اللہ بن دینار، امام زہری وغیرہ۔

اس فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بڑے بڑے اہل علم و کمال شامل تھے، امام زہری اور عروہ بن زبیر فن سیرت و مغازی کے آفتاب و ماہتاب تھے اور حضرت عکرمہ مولیٰ ابن عباس کے متعلق امام ذہبی فرماتے ہیں کہ: "تابعین میں سیرت نبوی کے متعلق سب سے زیادہ معلومات رکھتے تھے"[10]۔

تلامذہ

موسیٰ بن عقبہ کے شاگردوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے جس میں ان کے بھتیجے اسماعیل بن ابراہیم بن عقبہ بھی ہیں جو بالعموم مغازی کی روایات ہی بیان کرتے ہیں، ان کے علاوہ محمد بن فلیح، ابراہیم بن طہمان، حفص بن میسرہ، عبد الرحمن بن عبد القار، فضیل بن سلیمان، مخلد بن حسین، بکیر بن اشج، یحییٰ بن سعید انصاری، امام مالک

وہب بن خالد، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، ابن جریج، عبداللہ بن مبارک، ابو قرۃ موسیٰ بن طارق، ابو ضمرہ انس بن عیاض اور ابو بدر شجاع بن ولید وغیرہ جیسے جلیل القدر اہل علم کے نام بھی ملتے ہیں۔

فن حدیث میں درجہ موسیٰ بن عقبہ مغازی اور فقہ و افتا کے علاوہ حدیث میں بھی ممتاز تھے، ائمہ جرح و تعدیل نے ان کی ثقاہت کا اعتراف کیا ہے، حدیث کی اکثر اہم کتابوں جیسے صحاح ستہ، موطا، مسند احمد بن حنبل، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، مسند حمیدی، المستدرک للحاکم اور دیگر کتب حدیث میں ان کی مرویات موجود ہیں، جن کی تعداد سو سے متجاوز ہوگی۔

موسیٰ بن عقبہ اور فن سیرت نگاری موسیٰ بن عقبہ کا شمار اہم اور قدیم سیرت نگاروں میں ہوتا ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں "کان اول من صنف فی ذلک"[۱۱] (اس فن میں سب سے پہلے انہوں نے تصنیف لکھی)۔ لیکن سوئے اتفاق سے دیگر کتب سیرت کی طرح ان کی یہ تصنیف بھی دستبرد حوادث کی نذر ہوگئی اور اب اس کے منتشر اجزاء ہی سیرت کی موجودہ متداول کتابوں میں ملتے ہیں۔ انہیں منتشر اجزا کی مدد سے سطور ذیل میں اس کتاب کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوسکے۔

مغازی موسیٰ بن عقبہ[ع] "مغازی موسیٰ بن عقبہ" اپنے وقت کی مشہور و متداول

ع ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری مولف "السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ" اس دور کے مشہور ماہر سیرت ہیں، ان کی نگرانی میں استاذ محمد باقشیش نے ایم اے کے لیے مغازی موسیٰ بن عقبہ پر ایک مقالہ لکھا تھا جو بڑی کوشش کے باوجود ہمیں دستیاب نہیں ہوسکا۔

کتاب تھی، جس میں امام زہری سے براہ راست استفادہ کے علاوہ اس وقت تک کے دستیاب تحریری مواد سے بھی اخذ و استفادہ کیا گیا تھا، جوزف ہوروتوس کے بیان کے مطابق موسیٰ کے پاس حضرت ابن عباس کے کچھ صحیفے اور بعض دستاویز تھے، جیسے وہ نامہ مبارک جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منذر بن ساوی کے پاس بھیجا تھا۔ ان سب سے انہوں نے اس کتاب کی تالیف میں فائدہ اٹھایا تھا۔ علمائے سیر نے اسے "اصح الکتب" قرار دیا ہے[۱۳]۔ امام ذہبی کا خیال ہے کہ غالبہا صحیح و مرسل جید[۱۴]۔ حافظ ابن کثیر نے موسیٰ کو اس فن کا امام کہا ہے[۱۵]۔ امام مالک سے مروی ہے "علیکم بمغازی الرجل الصالح موسی بن عقبہ فانہ ثقۃ" دوسری روایت ہے "انہ رجل ثقۃ طلبہا علی کبر السن ولم یکثر کما اکثر غیرہ"[۱۶]، ایک جگہ فرماتے ہیں "من کان فی کتاب موسی قد شہد بدرا فقد شہدہا ومن لم یکن فیہ فلم یشہدہا"[۱۷]۔

آخر عمر میں مغازی کی طرف توجہ کی وجہ امام مالک کے قول "طلبہا علی کبر السن" سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ بن عقبہ نے مغازی سے دلچسپی اور واقفیت کے باوجود غالباً اخیر عمر میں اس کی طرف اس لیے توجہ دی کہ ابتداً انہوں نے علم حدیث کی تحصیل و اشاعت کی طرف اپنی تمام تر توجہ مبذول رکھی ہوگی۔

مغازی کی صحت و بلند پائیگی حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ موسیٰ بن عقبہ کی مغازی میں اصحاب عقبہ، مہاجرین، حبشہ و مدینہ، اصحاب بدر، شہدائے بدر، شہدائے احد وغیرہ کی فہرستیں تھیں، ..... جو ان کی فن مغازی سے واقفیت کا ثبوت ہے، مگر اس موضوع پر انہوں نے آخر عمر میں کتاب لکھی تھی، اس بنا پر ان کی کتاب بہت

زیادہ صحیح روایات پر مبنی رہی ہوگی کیونکہ پختہ عمر کی تحریر زیادہ معیاری اور بلند پایہ ہوتی ہے۔ جبکہ ان کے معاصر ابن اسحاق نے اپنی کتاب عنفوان شباب میں لکھی تھی لہذا اس کا درجہ مغازی موسیٰ بن عقبہ سے کمتر ہوگا، لیکن ابن اسحاق کو خوش قسمتی سے ابن ہشام جیسا راوی مل گیا جس نے انہیں شہرت دوام بخش دی، لیکن دیگر کتب سیرت کے مولفین کی طرح موسیٰ بن عقبہ کو بھی کوئی ابن ہشام نہ مل سکا۔

یہ مغازی کب تک موجود رہی موسیٰ کی کتاب کی موجودگی کا پتہ بقول جوزف ہوروتوس دسویں صدی ہجری تک چلتا ہے، "تاریخ الخمیس" کے مصنف دیار بکری نے اس سے براہ راست استفادہ کیا تھا[۱۸] مگر اس ناچیز کی تحقیق کے مطابق اس کی موجودگی گیارہویں صدی تک تقریباً یقینی ہے کیونکہ ابن عماد حنبلی (م ۱۰۸۹ھ) کا قول ہے "سنف المغازی فاجاد و وصلت الینا"[۱۹] عصر حاضر میں دمشق کے بعض اعیان نے لوئس اسپرنگر مشہور مستشرق کو اس کا مخطوطہ دکھانے کے لیے بلایا تھا لیکن وہ اس کی زیارت نہ کر سکا[۲۰]

مغازی سے استفادہ کرنے والے کبار علما مغازی موسیٰ بن عقبہ سے استفادہ کرنے والوں میں واقدی، امام بخاری، ابن سعد، ابن جریر طبری، امام احمد بن حنبل، حافظ ابن عبد البر، ابو نعیم اصفہانی، امام بیہقی، یاقوت رومی مولف معجم الادباء، حافظ ابن کثیر، علامہ ذہبی، حافظ ابن حجر، ابن قاضی شہبۃ، ابن سید الناس، امام کلاعی، دیار بکری مولف تاریخ الخمیس، امام قسطلانی اور سیرت شامیہ کے مصنف صالحی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے اس کتاب سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔

مغازی کے مختصر ہونے کی بحث راقم کو تلاش و تفتیش سے معلوم ہوا کہ مغازی موسیٰ بن عقبہ

کے مرویات ۰۰ اسے زیادہ کتابوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ منقول ہیں مگر اس کے بارے میں امام مالک کے قول "لم یکثر کما اکثر غیرہ" اور ذہبی کے قول "فھی فی مجلد لیس بالکبیر"[۲۱] سے محققین کو خیال ہوا ہے کہ وہ بہت مختصر تھی لیکن ہمارے سامنے اس کی جو موجودہ روایات ہیں ان سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی علاوہ ازیں ابن عبد البر کی الدرر اور ابن سید الناس کی عیون الاثر کو محققین نے اس کا اختصار بتایا ہے اور جب اختصار کا یہ حال ہے تو اصل کیسے بقدر مختصر ہوگی، علامہ ابن حجر نے الاصابۃ میں اس کی تقریباً ۲۲۵ روایات محفوظ کر دی ہیں،[۲۲] بیہقی نے دلائل النبوۃ میں اس کی طویل عبارتیں درج کی ہیں، خصوصاً غزوۂ بدر کی روایات ایک ہی سند سے پیش کرتے ہیں جن میں سے بعض بیسوں صفحات پر مشتمل ہیں،[۲۳] ان کے علاوہ فواد سیزگین نے چند اور مصادر کی نشاندہی کی ہے جن میں اس کے نصوص موجود ہیں۔[۲۴]

ان مصادر اور ان میں موجود طویل اور مفصل روایات کو دیکھتے ہوئے یہ بات خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ہم اسے مختصر قرار دیں، ہاں ذہبی کے بیان سے یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک ہی جلد میں تھی لیکن اتنی مختصر نہیں تھی جتنی کہ ان کے بیان "فتحتاج الی زیادۃ بیان و تتمۃ"[۲۵] سے ظاہر ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ یہ تصنیف و تالیف کا ابتدائی دور تھا اس لیے اس وقت ضخیم کتابیں لکھنے کا رواج نہ تھا۔

امام ذہبی کثیر التصانیف تھے، ان کی تصنیفات نہایت ضخیم ہیں، سیر اعلام النبلاء ۲۵ جلدوں میں تھی اور تاریخ الاسلام تقریباً چالیس جلدوں پر مشتمل ہے

اور السیرۃ النبویہ جو اسی کا ایک جز تھی پانچسو صفحوں پر مشتمل تھی، اس قدر ضخیم کتابیں لکھنے والے کو موسیٰ بن عقبہ کی مغازی بہر حال مختصر معلوم ہوگی، تاہم اگر اس کے دستیاب مواد کو مرتب کیا جائے تو وہ دو سو صفحوں میں آئے گی اور اگر گم شدہ حصے بھی مل جائیں تو پانچ چھ سو صفحات میں آئے گی اس لیے اس کو بہت مختصر سمجھنا غلط ہوگا۔

جرمن مستشرق نے ۱۹۰۴ء میں اس کے بعض حصہ کو جرمن ترجمہ کے ساتھ اس دعویٰ کے ساتھ پیش کیا تھا کہ یہ مغازی ابن عقبہ کے ہی حصہ ہیں، یہ حصہ بیس روایات پر مشتمل ہے جس کا انگریزی ترجمہ الفریڈ گیوم نے اپنی کتاب "سیرت ابن اسحاق" کے مقدمہ کے آخر میں پیش کیا ہے، عام طور سے یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہی باقی ماندہ دستیاب حصہ ہے لیکن التاریخ العربی والمورخون کے مصنف نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ سخاؤ نے اس کے دستیاب شدہ حصہ کے ضمن بعض اجزا ہی شایع کیے ہیں، بقیہ حصہ برلن کی لائبریری میں موجود ہے جسے مستشرق شاخت نے ایڈٹ کر دیا ہے لیکن ابھی تک اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی ہے[26]، اس کے باوجود دستیاب شدہ حصہ شبہ سے بالاتر نہیں ہے۔

مغازی کے موضوعات | مغازی موسیٰ بن عقبہ کی دستیاب شدہ روایات کے عناوین سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں غزوات کے علاوہ سیرت نبوی کے دوسرے پہلو بھی زیر بحث آئے ہیں، اس کے مواد کو اگر موضوع کے اعتبار سے مرتب کیا جائے تو سینکڑوں عنوانات بن سکتے ہیں جیسے خاندان ونسب، عہد جاہلیت ولادت، بعثت، وحی کی ابتدا، سب سے پہلے اسلام لانے والے، قریش کا بائیکاٹ شعب ابی طالب میں محصوری، ہجرت حبشہ، حضرت خدیجہ کی وفات، سفر طائف

بیعت عقبہ، ہجرت مدینہ، مختلف غزوات وسرایا وغیرہ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب محض غزوات وسرایا ہی پر مشتمل نہیں ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ دستیاب شدہ حصے سے سیرت نبوی کے تمام گوشے سامنے آتے ہیں، اس کمی کی تلافی اسی وقت ہو سکتی ہے جب کتاب کے دوسرے مرویات و حصص بھی دستیاب ہو جائیں جس کے لیے یہ ناچیز ارباب علم ودانش کی مدد کا خواستگار ہے، اگر وہ اس باب میں میری رہنمائی فرمائیں تو میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔

مغازی کی وسعت | دستیاب شدہ مواد سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب دور نبوی ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کے دائرے میں خلفائے راشدین کا عہد بھی شامل ہے، التاریخ العربی والمورخون کے مصنف نے اس کا دائرہ عہد اموی تک وسیع کر دیا ہے جس کی تائید جوزف ہورووتس کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ "موسیٰ کے اولین راوی اور پیش روان کے نانا ابوحبیبہ ہیں جن کے حوالے سے انہوں نے سلاوہ تک کے بعض حوادث بیان کیے ہیں"[27]

مغازی کی ادبی دلکشی | مغازی موسیٰ بن عقبہ ادبی حیثیت سے بھی اہم ہے اس کے دستیاب بعض اجزا کو عربی زبان وادب کا بہترین نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے ان میں سلاست وروانی اور بیان کی سادگی کے علاوہ بڑی حلاوت بھی ہے، مصنف کے انداز بیان کی وجہ سے قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ عہد نبوی میں پہنچ گیا ہے، اور یہ واقعات گویا اس کے سامنے پیش آرہے ہیں، امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں موسیٰ سے مروی جو روایات نقل کی ہیں ان سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

مغازی میں بعض نئے معلومات | مغازی موسیٰ بن عقبہ سے بعض نئے معلومات بھی

دستیاب ہوتے ہیں اور بعض امور میں ان کی رائے عام سیرت نگاروں سے مختلف بھی ہے جیسے عام ارباب سیر کے خیال میں غزوہ احد میں ستر صحابۂ کرام شہید ہوئے لیکن ابن عقبہ نے شہید ہونے والوں کی تعداد چھیالیس بتائی ہے[1]، غزوۂ خندق کا وقوع ۵ھ کے بجائے وہ ۴ھ بتاتے ہیں، اسی طرح کے دوسروں سے ان کے بعض اختلافات بھی ہیں۔

بعض اور خصوصیات موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کے مرویات کے جائزہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں سند کا مکمل التزام کیا گیا ہے، واقعات کا تذکرہ تاریخی ترتیب کے مطابق ہے اور ابن اسحاق کے برخلاف وہ کبھی کبھی اشعار سے استشہاد کرتے ہیں[2]، واقعات کے ضمن میں مختلف قسم کی وضاحتیں بھی کرتے ہیں اور نزول آیات کے اسباب وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مغازی موسیٰ بن عقبہ کی ان خوبیوں اور خصوصیات کی وجہ سے اسے بڑی مقبولیت نصیب ہوئی اور وہ ہر زمانہ کے اصحاب علم میں متداول رہی۔ اللہ تعالیٰ اس کی مکمل بازیافت کا سامان کر دے، کیونکہ اس سے عہد تابعین میں سیرت کے ارتقائی مراحل اور اس عہد کے تصنیفی انداز و مذاق کا پتہ چل سکتا ہے، اور ممکن ہے اس کی بازیافت سے سیرت نبوی کے ایسے پہلو بھی سامنے آئیں جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں۔

حواشی

[1] اکرم ضیاء عمری: السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، مرکز بحوث السنۃ والسیرۃ ۱۹۹۱ء ص ۵۳/۱ [2] تفصیل کے لیے دیکھئے، کشف الظنون ۱۷۴۷-۱۷۴۶/۲، جوزف ہورووتس:

سیرت نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مولفین' فواد سیزگین: تاریخ التراث الاسلامی جلد اول وغیرہ [3] فواد سیزگین: تاریخ التراث العربی، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب ۱۹۷۷ء ص ۴۴۶-۴۴۴-۴۴۳/۱ [4] جوزف ہورووتس: سیرت نبوی کی اولین کتابیں اور ان کے مولفین (ترجمہ نثار فاروقی) نقوش سیرت رسول نمبر ص ۴۵۷/۱ [5] ابن عبدالبر: الاستیعاب، ص ۳۰۰/۵ [6] ابن حجر، تہذیب التہذیب' دائرۃ المعارف العثمانیہ' حیدرآباد ۳۶۲/۱۰ [7] ذہبی: تاریخ الاسلام ص ۱۳۴/۶ [8] جوزف ہورووتس: نقوش سیرت رسول نمبر، ص ۴۵۷/۱۔ یہی سن وفات اکثر مورخین نے بھی لکھا ہے تاہم ۱۴۲ھ اور ۱۴۱ھ کی روایتیں بھی ملتی ہیں [9] ذہبی: تاریخ الاسلام ص ۱۳۴/۶ [10] ذہبی: سیر اعلام النبلاء، تحقیق: شعیب ارنوؤط، موسسۃ الرسالۃ ۱۹۹۲ء ص ۱۷/۵ [11] دیکھئے: تہذیب التہذیب: ص ۳۶۲/۱۰ مراۃ الجنان: ص ۲۹۲/۱ [12] ذہبی سیر اعلام النبلاء ص ۱۱۴/۶ [13] تہذیب التہذیب ص ۳۶۲/۱۰ [14] سیر اعلام النبلاء: ص ۱۱۶/۶ [15] ابن کثیر: البدایۃ والنہایۃ ص ۲۲۸/۳ [16] المقریزی: امتاع الاسماع، تحقیق محمود محمد شاکر، القاہرہ ۱۹۴۱ء ص ۲۶/۱ [17] سیر اعلام النبلاء: ص ۱۱۶/۶ [18] نقوش سیرت رسول نمبر، ص ۵۴۷/۱ وما بعد [19] ابن عماد حنبلی: شذرات الذہب، دار الکتب العلمیۃ ص ۲۱۰/۱ [20] نقوش سیرت رسول نمبر ص ۵۴۷/۱ وما بعد [21] سیر اعلام النبلاء: ص ۱۱۵/۶ [22] التاریخ العربی والمورخون: ص ۱۵۹/۱ [23] بیہقی: دلائل النبوۃ ص ۱۶۳-۱۰۱/۳ (تحقیق: قلعجی) [24] فواد سیزگین، تاریخ التراث العربی، ص ۵۸-۵۹/۱ [25] سیر اعلام النبلاء ص ۱۱۵/۶ [26] التاریخ العربی والمورخون: شاکر مصطفیٰ ص ۱۵۹/۱ [27] بحوالہ نقوش۔ سیرت رسول نمبر: ص ۵۶/۱، [28] بیہقی: دلائل النبوۃ، ص ۲۰۸-۲۰۹/۳۔

شہزادی اثیمہ آرکاٹی کی مثنویاں

از جناب کاوش بدری صاحب میسور

(یہ مقالہ ۱۰ دسمبر ۱۹۹۵ء کو اسلامیہ کالج وانم باڑی کے جشن یوم اردو کے ادبی مذاکرہ میں پڑھا گیا)

شہزادی اثیمہ کرناٹک کے مذہبی گھرانے کی عظیم شاعرہ تھیں، انکا نام لطف النـ بیگم تھا، ان کی ولادت آرکاٹ میں ہوئی، مورخین کا قیاس ہے کہ ان کی ولادت ۱۲۴۱ھ م ۱۸۲۵ء یا ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں ہوئی، مولانا افتخار جو اس عہد کے جید عالم اور باکمال شاعر تھے اثیمہ کے قریبی رشتہ دار اور استاد تھے۔ ان کے شوہر قادر محی الدین خاں سکندر جنگ ثانی تھے، ان سے ان کی شادی صغر سنی میں ہوگئی تھی، ان کا سال وفات محمد منور گوہر نے ۱۲۶۶ھ / ۱۸۴۹ء بتایا ہے، اثیمہ ۱۸۷۲ء تک بقید حیات رہیں اور کبر سنی میں بھی تصنیف و تالیف میں منہمک رہتی تھیں حضرت شاکر مدراسی نے اپنی دادی اثیمہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نواب والاجاہ کی نواسی اور عالمہ و زاہدہ و شاعرہ تھیں۔ گیارہ حج کیے، نظم و نثر پر پوری قدرت رکھتی تھیں، زہد و تقویٰ، محاسن اخلاق اور مکارم عادات میں اپنے خاندان میں ممتاز تھیں، ان کی چھ ہزار بیت کی ایک قابل دید اور لاجواب مثنو

حضرت اثیمہ کے شوہر سکندر جنگ بہادر اول پرنس آف آرکاٹ نواب عظیم جاہ بہادر کے حقیقی خالہ زاد بھائی اور نواب انورالدین خاںؒ شہید گرٹھ آمبور (شمالی آرکاٹ۔ تمل ناڈو) کے پرنواسے تھے۔ حضرت اثیمہ کے اجداد میں فرخ شاہ اور سلیمان شاہ فرمان روایان تخت کابل بھی گزرے ہیں، اس لحاظ سے اثیمہ کو راقم الحروف نہ صرف شہزادی بلکہ ملکہ مثنوی گردانتا ہے، ان کے نانا محمد علی خاں المتخلص بہ والاجاہ (فرمانروائے کرناٹک) تھے اور والد نجف علی خاں بن عبدالغنی خاں سے غلام مرتضیٰ خاں قلعدار ویلور کی نواسی رضیہ بیگم منسوب تھیں۔ خان موصوف علی دوست خاں ناظم دوم آرکاٹ کے حقیقی بھتیجے اور داماد بھی تھے، اس طرح نواب صاحب ممدوح بھی اثیمہ کے جد مادری ہوئے، اثیمہ نے اپنی مثنوی "گلشن مہوشاں (مخطوطہ آصفیہ) میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

وہ اے شمع کاشانۂ انوری	وہ اے راحت جان والاجہی
علی دوست خاں کی نواسی تو ہے	رئیسوں کے بستاں کی سرو سہی

حاجی نجف علی خاں المتخلص بہ افتخار مدراسی کے کئی لڑکے اور لڑکیاں تھیں بڑے صاحبزادے اعتماد الدولہ بہادر اور دوسرے قادر علی خاں بہادر منور جنگ نظیر تخلص کرتے تھے، اثیمہ نے اپنی ایک بڑی بہن کا ذکر بھی کیا ہے جو نواب غلام مرتضیٰ خاں بہادر ثابت جنگ ممتاز الملک رفیع الدولہ مدراسی سے منسوب تھیں اور یہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ شاعرہ گزری ہیں، اثیمہ کی تعلیم و تربیت ان کے پدر بزرگوار کے سایہ عاطفت میں ہوئی، بعض دوسرے اہل کمال سے بھی

تحصیل علم کی۔ اثیمہ کی مثنویوں کے قطعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نجف علی خاں کی بڑی صاحبزادی کا بیاہ نواب غلام مرتضیٰ خاں ثابت جنگ مختار الملک رفیع الدولہ سے ہوا تھا اور دوسری صاحبزادی خود اثیمہ ہیں جنھوں نے اپنی مثنوی "نسب نامہ" میں خاندانی حالات کو منظوم کرتے ہوئے خود اپنی شادی اور اولاد اور ان کی شادیوں کے علاوہ دوستوں کے حالات بھی بیان کیے ہیں، اثیمہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا عبدالغنی کے تین بیٹے تھے، بڑے فرزند سکندر جنگ دوسرے کا نام فضل حسین اور تیسرے نجف علی خاں افتخار تھے، پہلے گزر چکا ہے کہ نجف علی خاں کی شادی محمد زماں خاں حیدر کی لڑکی یعنی غلام مرتضیٰ خاں قلعدار ویلور کی نواسی سے ہوئی تھی جن کے بطن سے دو لڑکیاں اور دو لڑکے ہوئے، بڑی لڑکی غلام مرتضیٰ خاں جنگ سے منسوب تھیں اور دوسری اثیمہ نواب سکندر جنگ ثانی سے منسوب ہوئیں۔ ایک صاحبزادے قادر علی خاں منور جنگ نظیر قلم بند مہدی ثاقب مدراسی اور دوسرے قادر حسین خاں آصف جنگ تھے، نجف علی خاں افتخار عربی و فارسی کے جید عالم و شاعر تھے، ان کی تصانیف میں مثنوی بہار صحیفہ و خزانیہ اور شرح سکندر نامہ مشہور ہیں، موصوف کا مدفن مکہ معظمہ میں ہے، خوش قسمتی سے اثیمہ کے شوہر قادر محی الدین خاں سکندر جنگ ثانی بھی عربی فارسی کے بڑے ماہر تھے۔ فن خوشنویسی یعنی خط نسخ و نستعلیق شفیعہ و گلزار و خط ناخن و غبار میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ شہسواری میں یکتا اور خودداری میں ضرب المثل تھے مگر عالم جوانی ہی میں ان کا انتقال ۱۲۶۸ھ سے پہلے ہوگیا۔

والاجاہ کے شاہی گھرانے کی خواتین عربی فارسی اور دکنی سے بخوبی واقف تھیں

جس کا ثبوت وہ مخطوطات ہیں جن پر خواتین نے اپنی مہر ثبت کی ہے۔

اثیمہ کی تصانیف

(۱) قصہ جہاں ضرب، یہ نثری داستان فارسی میں ہے جو والاجاہی کتب خانہ میں دستیاب ہے (۲) دیوان اردو۔ یہ دیوان ڈاکٹر محمد غوث سابق لائبریرین مخطوطات جامعہ عثمانیہ کے آبائی کتب خانہ میں محفوظ ہے (۳) مثنوی گلشن مہوشاں۔ ایک مخطوطہ سالار جنگ لائبریری میں دوسرا حیدرآباد سنٹرل لائبریری میں محفوظ ہے (۴) مثنوی گلشن عاشقاں عرف گلبن مہر خاں۔ مخطوطہ حیدرآباد سنٹرل لائبریری میں محفوظ ہے (۵) مثنوی گلشن شاہداں۔ مخطوطہ حیدرآباد سنٹرل لائبریری میں محفوظ ہے۔ (۶) نسب نامہ والاجاہی۔ کتب خانہ حیدرآباد میں مخطوطہ (۷) تعلیم نامہ (۸) جہان فریب۔

مثنوی نگاری میں اثیمہ کا درجہ

اثیمہ کی مثنویوں کو اساتذہ فن اور محققین نے میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اور مصحفی، جرات اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنویوں کے مقابلے میں پیش کیا ہے، مثنوی گلبن مہر خاں، میر تقی میر کی مثنوی دریائے عشق" اور حضرت سید محمد والا آرکاٹی کی مثنوی "طالب و موہنی" سے ملتی جلتی ہے، یہ مثنوی چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے جو ۱۸۵۶ء میں شایع ہوئی تھی۔ اثیمہ نے اپنی مشہور فارسی مثنوی "جہاں ضرب" کا منظوم اردو ترجمہ بھی کیا تھا جو مثنوی گلشن مہوشاں کے نام سے ۱۸۶۰ء میں شایع ہوکر مقبول ہوا۔ پروفیسر محمد یوسف کوکن عمری مرحوم نے اپنی تحقیقی کتاب "عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک مطبوعہ ۱۹۷۴ء میں اثیمہ کی دو اور مثنویوں کا ذکر بھی فرمایا ہے جو مثنوی جہان فریب اور نسب نامہ کے نام سے موسوم ہیں۔ نسب نامہ نظم و نثر میں ہے۔ اثیمہ نے اپنی شعری تصانیف کو

گو عرصہ دراز تک پوشیدہ رکھا مگر محلات کی بیگمات میں اکثر کو ان کا علم تھا، سخاوت مرزا نے لکھا ہے کہ مثنوی گلبن مہرخاں کتب خانہ آصفیہ میں مخطوطہ نمبر ۴۴۶ ہے، سن کتابت درج نہیں ہے۔ اثیمہ کی یہ پہلی شعری تصنیف ہے جو ۱۲۶۸ھ میں لکھی گئی، جس کے جملہ صفحات ۱۸۸ اور ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں، اشعار کی تعداد تقریباً ۱۳۹۶ ہیں اور پانچ جشنوں پر مشتمل ہے (۲) مثنوی گلشن شاہداں کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے جس کے صفحات ۱۷، سطر ۹ تقطیع متوسط سن کتابت ۱۲۹۴ھ اور ۹۳۹ ابیات ہیں (۳) مثنوی گلشن مہوشاں کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے جس کے صفحات ۱۲۷۲ اور صفحے کی سطریں ۱۲۱ اور کل ابیات ۵۳۷۶ ہیں۔ سخاوت مرزا نے اثیمہ کی شاعری پر یوں روشنی ڈالی ہے کہ اثیمہ کی اردو بہ لحاظ مدراسی خاتون ہونے کے فصیح ہے، فارسی کا اثر غالب ہے۔ تسلسل مضمون ہے۔ واقعہ نگاری اور فطرت نگاری کا جواب نہیں ہے۔ آج سے ایک صدی پیشتر ایک ایسی اچھی شاعرہ پیدا ہوئی جس کی نظیر نہیں۔ اور اس نے خصوصاً مثنوی نگاری میں میر حسن جیسے اہل کمال کا تتبع کیا ہے اور عورتوں کے لیے ایک ایسا سوشل معاشرتی افسانہ لکھا جس کی زمانہ کو ضرورت تھی اور جس کی جھلک متاخرین میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی کے افسانوں میں پائی جاتی ہے۔

اودیش رانی نے سخاوت مرزا کے بیان پر یہ اضافہ کیا ہے کہ (۱) مثنوی گلبن مہرخاں عرف گلشن عاشقاں کا ایک مخطوطہ حیدرآباد سنٹرل لائبریری میں محفوظ ہے جو تیرہ ابواب پر مشتمل ہے، اشعار کی تعداد ۱۴۲۸ ہے، اس میں پانچ غزلیات بھی ہیں اور موقع بہ موقع حافظ شیرازی کی پانچ غزلیں بھی درج کی ہیں۔

اثیمہ کے تقریباً تمام عزیز و اقارب نے اس مثنوی کے لیے قطعات تاریخ لکھے ہیں۔ حسینہ بیگم دختر خانوادہ قاضی بدر الدولہ کی بیاض میں بھی اس مثنوی کے سلسلے میں قطعات تاریخ ملتے ہیں۔ اودیش رانی کا خیال ہے کہ اثیمہ کی دکنی یا اردو نہ تو دہلوی ہے نہ لکھنوی ہے اور نہ ہی اس کو قطب شاہی اور عادل شاہی دور کی دکنی کہا جا سکتا ہے، یہ دکنی اپنی علیحدہ انفرادیت رکھتی ہے جس میں لکھنؤ اسکول کی مرصع نگاری اور دہلی کے اساتذہ فن کی سی فکری گہرائی ہے، اس کے علاوہ قطب شاہی اور عادل شاہی دور کا ادبی رجحان بھی ہے، اردو دنیا کی اخلاقی مثنویوں میں اثیمہ کی مثنویوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

راقم الحروف کی نظر میں اثیمہ کی زبان نہ عام اردو ہے نہ دکنی بلکہ انکی مثنویوں میں موضوع اور پس منظر کے لحاظ سے ایک نئی فکری اور فطری زبان نے جنم لیا ہے۔ جو اس سے پہلے کسی کے ہاں نظر نہیں آتی، عربی اور فارسی کی دلآویز آمیزش کے باوصف اثیمہ کی شاعری قاری کو لغات کے صفحات پلٹ کر الفاظ کے معانی ڈھونڈنے پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ سمجھنے اور بوجھنے کی سہولت فراہم کرتی ہے، ان کی شاعری میں مشرقی تہذیب سانس لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، انھوں نے اپنی مثنویوں میں شادی برات کے ہنگامے، دسترخوان پر چنے ہوئے ایوان نعمت، محلات کی آرائش کھیتوں اور باغوں کی بہار، مختلف النوع رسوم، شب عروسی، طلوع آفتاب و غروب ماہتاب کا سماں، راگ، رقص، حسن و عشق کے کرشمے، مجرے، قوالیاں، جلال و جمال، داستان در داستاں، لطائف، کہاوت، جدید و قدیم محاورے، تشبیہات کے استعمال میں ایک مفکر شاعرہ ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ غرض

ان کی مثنویوں میں والا جاہی دور کے شاہانہ طمطراق کے علاوہ انسانی زندگی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں، گلبنِ مہر خاں ایک ایسی مثنوی ہے جو مشرقی و مغربی تہذیب کا سنگم ہے اور یہ پانچ جشنوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے، جس میں ماہ رمضان کی فضیلت، شب معراج کی عظمت بیان کی گئی ہے اور یہ مثنوی تیرہویں صدی کے اس ماحول کی آئینہ دار ہے جبکہ مغربی تہذیب مدراس کے عظیم شاہی محلات اور فلک بوس ایوانوں پر اثر انداز ہو رہی تھی اور مغربی صنعت و حرفت سے نوابین اور امراء کے علاوہ عوام کا ایک بڑا طبقہ متاثر ہو رہا تھا اور ایڈورڈ بالفور مدرسۂ اعظم مدراس اور کتب خانہ عام اہل اسلام کو مغرب زدہ بنانے میں منہمک تھا۔ اثیمہ نے ہر جشن میں فضائل نماز پر کاربند ہونے کا منظر بھی پیش کیا ہے۔ اثیمہ کی مثنویوں کے کل اشعار کی تعداد اس طرح ہے ۷۲۰ (گلشن شاہان) ۱۴۲۸ (گلشن عاشقاں) ۱۳۹۶ (گلبنِ مہر خاں) ۵۳۷۶ (گلشن مہوشاں) گویا کل اشعار ۸۹۲۰ ہیں۔

حضرت اثیمہ اور ان کے خاندان کی فارسی، عربی اور اردو میں قابلیت اور قادر الکلامی مسلم ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں تاہم مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک بیان نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا، فرماتے ہیں:

"مدراس میں جو سب سے عجیب چیز دیکھی وہ ایک شاعری کا گھرانہ تھا۔ حضرت شاکر مدراسی صاحب کے والد مرحوم فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے، شاکر صاحب خود اردو و فارسی کے برجستہ گو شاعر ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ اور ان کی دو صاحبزادیاں بھی فارسی کی شاعرہ ہیں۔ حسب ایماء شاکر صاحب نے

ان خواتین کو یہ مصرع طرح دیا۔ ع بہ شہر خود روم و شہریار خود باشم۔ اس پر اہلیہ نے تین شعر اور چھوٹی صاحبزادی نے پانچ شعر لکھ کر بھیجے، میں دنگ رہ گیا۔ بڑی صاحبزادی نے نثر کو نظم کیا۔ سیرۃ النبی حصہ دوم سے حضرت جابرؓ اور یہودی قرض خواہ کا واقعہ نکال کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہنامہ کی بحر اور زبان میں مثنوی کے دس پندرہ شعر میں نظم کر کے بھیج دیا۔
بارک اللہ فی بیت العلم ہٰذا۔" (معارف نومبر ۱۹۲۵ء)

اثیمہ کی اولاد و احفاد

اثیمہ کے تین فرزند تھے (۱) سب سے بڑے مولانا مولوی محمد عبدالغنی خاں بہادر امیر نادرۂ روزگار شخص تھے۔ پندرہویں برس قصۂ یوسف زلیخا کو فارسی میں نظم کیا تھا اور سترہ سال کی عمر میں ایک طولانی قصیدۂ عربی صنعت عاطلہ میں کہا تھا جو مطبوع و مقبول و مشہور ہوا۔ موصوف بنگال اور شمالی ہند میں قدر کی نظر سے دیکھے گئے۔ ویلور کے مشہور فاضلِ اجل و عارف کامل سید غلام محی الدینؒ ویلوری سے بیعت اور عربی فارسی اور انگریزی کے فارغ التحصیل تھے۔ ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر بھی فائز ہوئے اور مدراس یونیورسٹی کے فیلو اور میونسپل کمشنر بھی تھے۔ ان کی سالانہ آمدنی قریباً "آٹھ ہزار روپے تھی، سخاوت مرزا نے لکھا ہے کہ ان کی مشہور تصانیف میں "انوار عظیم (بے نقط فارسی) اور "عربی قصیدہ" قابل ذکر ہیں۔ (۲) دوسرے فرزند عبدالواسع خاں حافظ حاجی تھے جن کا سال ولادت ۱۲۶۱ھ ہے (۳) تیسرے عبدالصمد خاں ماہر تھے۔ موصوف عربی فارسی اور انگریزی کے فاضل، حافظِ قرآن، اچھے خطاط اور فارسی کے جید شاعر تھے"۔ "قصائد ماہر" و "دیوان ماہر" طبع ہو چکے ہیں۔ موصوف ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ بھی رہے۔ اپنے

انھی صاحبزادے کی دلہن کو اثیمہ نے اپنی مثنوی "گلشن عاشقاں" بوقت رونمائی پیش کی تھی۔ ماہر کی تصویر صحیفۂ زریں مطبوعہ نول کشور کانپور مطبوعہ ۱۹۰۲ء کے صفحہ نمبر ۷۵ پر موجود ہے۔

اثیمہ کے پوتے ابوالمعانی شمس العلماء مولانا محمد عبدالرحمٰن شاطر مدراسی متوفی ۱۹۲۳ء ایک عظیم مفکر شاعر کی حیثیت سے عربی فارسی اور اردو دنیا میں اپنا مقام حاصل کر چکے تھے جن کی معرکۃ الآرا شعری تصنیف "قصیدۂ اعجاز عشق" مطبوعہ ۱۹۰۲ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں شریک کی گئی تھی۔ اس قصیدہ میں سعدیٔ ہندوستان شمس العلماء مولانا مولوی الطاف حسین حالی، شمس العلماء مولانا مولوی خان بہادر ذکاء اللہ دہلوی، مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی، خان بہادر مولانا مولوی سید علی محمد شاد عظیم آبادی، مولوی سید کاظم حسین محشر لکھنوی، مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی نظم لکھنوی، حکیم سید ضامن علی صاحب جلال لکھنوی، آنریبل مولوی شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا اقبال، شمس العلماء ڈاکٹر مولانا مولوی نذیر احمد خاں ایل ایل ڈی دہلوی، شمس العلماء مولانا مولوی شبلی نعمانی، خان بہادر مولوی سید اکبر حسین اکبر جج عدالتِ خفیفہ الہ آباد، آنربل نواب عماد الملک مولانا مولوی سید حسین بلگرامی رکن انڈیا کونسل، ....

..... مولوی سید وحید الدین سلیم، مولوی سید ظہیر الدین حسین خاں ظہیر دہلوی پروفیسر مولوی سید عبدالغفور شہباز، شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر ولا وغیرہم کے خطوط درج ہیں جو ۴ صفحات پر مشتمل ہیں، ہم طوالت کے خوف سے

صرف حالی اور اقبال کے دو خطوط نقل کرتے ہیں:

(۱) "نہایت تعجب ہوا کہ احاطہ مدراس میں ایسی صاف اور فصیح اردو، ایسی پاکیزہ نظم و نثر اور ایسا لطیف اور صحیح مذاق کیونکر پیدا ہوا اور کہاں سے آیا؟ آپ کے اشعار میں یقیناً وہ جوہر پاتا ہوں جو ترقی کرکے کمال شاعری کے درجہ تک پہونچ سکتی ہے۔ بلا مبالغہ و بلا تصنع آپ کے بعض شعروں کو دیکھ کر رشک آتا ہے کہ کیوں یہ پیرایہ بیان ہمارے ہاتھ نہ لگا۔" (الطاف حسین حالی پانی پت ۱۱/۱۱-۴-۱۹۰۴ء-)

(۲) "اس قصیدے (قصیدۂ اعجازِ عشق) کا کچھ حصہ "مخزن" میں شایع ہو چکا ہے اور پنجاب میں عموماً پسندیدگی اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ..... اکثر اشعار نہایت بلند پایہ اور معنی خیز ہیں۔ بندشیں صاف اور ستھری ہیں اور اشعار کا اندرونی درد مصنف کے چوٹ کھائے ہوئے دل کو نہایت نمایاں کرکے دکھا رہا ہے، آپ کا اسلوب بیان واقعی نرالا ہے اور آپ کی صفائی زبان آپ کے ہم وطنوں کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ آپ اصل میں ہندوستان کے رہنے والے ہوں گے مگر یہ معلوم کرکے کہ آپ کی پرورش بچپن سے مدراس میں ہوئی مجھے تعجب ہوا۔" (محمد اقبال ۲۲/۲-۵-۱۹۰۵ء-)

حضرت شاطر کے بھائیوں میں امیر الشعراء، نجم الفضلا، مولوی محمد منور گوہر مرحوم (سابق جونیر ریڈر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ مدراس یونیورسٹی) مولف تذکرۂ سخنورانِ بلند فکر (اردو) ہیں جو دو جلدوں میں ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۶ء میں شایع ہو کر ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام کرنے والے اساتذہ اور طلبہ کے لیے

آج بھی ممد و معاون ثابت ہو رہا ہے۔ حضرت عبد الغنی خاں امیر کے تینوں فرزند یعنی علامہ شاطر مدراسی، گوہر مدراسی اور عبد الباری خاں موجد مدراسی اپنے عہد کے عظیم شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت امیر کے چچا کا تخلص مجنوں اور ایک ماموں منور جنگ کا تخلص نظیر اور بھائی کا تخلص ماہر تھا۔

مثنویوں کے بعض اشعار ہندوستان بھر میں شاید ہی کوئی اور گھرانہ اثیمہ کے گھرانے کی طرح علم و فضل اور شعر و ادب میں عالمانہ اور شاعرانہ ایسا ممتاز رہا ہو۔ ذیل میں ان کی مثنویوں کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

محفل میں آرایش کی تعریف ملاحظہ ہو:

پلا ساقی یک جام عناب رنگ تفکر کے عالم میں ہے دل بہ تنگ
سماں ایک کر مطرب خوش کمال قلم سے بھی نکلے ہے فرخندہ فال

مکاں قصر یکسر تھا عالی نشاں فلک سے کرے ہمسری بیگماں
کہیں راگ مالا تھا بجتا ہوا کہیں تھیں تصاویر نازک ادا
تحائف نوادر تھے خوش اختراع کہیں شمع کافور کی تھی شعاع

کشتی کی توصیف دیکھیے!

جو تھے جلوہ گر اس میں خورشید رو گئی شرم سے نیلو فر سر خرد
خجالت سے غنچے ہوئے در حجاب ہوئے شرم سے گلرخاں کے گلاب
ادھر راگ گائن کا باصوت و ساز ادھر روشنی بھی تھی با امتیاز

باغ کا سماں ملاحظہ ہو:۔

وہ عکس ان کا تصویر سازی کرے تو آئینہ بلور بازی کرے

ذیل میں مثنوی گلشن مہ وشاں کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں:

نہیں مثنوی بلکہ گلزار ہے نہیں بلکہ یوسف کا بازار ہے
بہت ہم نے پی پی کے خون جگر لئے کان سینے سے لعل و گہر
فصیح البیاں اہل ہندوستاں سوا ان کے ہیں جو فصیح البیاں
نہ ممکن ہے ان سے کروں ہمسری ہیں ہندی میں ان کی کئی مثنوی
زن و مرد سے ہوں جو منصف صفات مری مثنوی کو لگا ان کے سات
کوئی شخص ہو علم سے بہرہ ور ہے دیوان لکھنا اسے سہل تر
مگر مثنوی کی ہے وقعت بڑی وہی جانے جس پر ہو محنت پڑی
حسن مرد میدان فضل و کمال لکھا مثنوی میں ہے یوں حسب حال
جوانی میں جب بن گیا ہوں میں پیر تب ایسے ہوئے ہیں سخن بے نظیر
جو یوں مثنوی سے ہو مردوں کا حال تو پھر عورتوں کا رہے کیا مجال
اب اے منصفو سامعو ناظریں مشقت مری ہو نہ ضایع کہیں
خطا کو دلوں میں چھپا لیجیے کرم میرے احوال پر کیجیے

حضرت شاہ نیاز احمد نیاز علیہ الرحمہ کا عربی کلام

از جناب ابو صہیب رومی مچھلی شہری

(۳)

جہاں تک زیر بحث مناجات کی نسبت شاعری کی تحقیق کا معاملہ ہے تو واقعہ یہ ہے کہ عربی ادب پر تحقیقی نظر رکھنے والے اہل فن اس مناجات کی "نسبت شاعری" کی صحت و واقعیت کو صرف "مشہور درمیانِ عوام" ہی کی حد تک جانتے اور سمجھتے ہیں ادب و تاریخ ادب کے محققین کے ہاں اس مناجات جیسی "مشہور عوام" چیزوں کی علٰحدہ ایک مستقل فہرست ہے، فارسی ادب و شاعری میں بھی کچھ ایسی ہی چیزیں پائی جاتی ہیں جن کی سند اس سے آگے نہیں بڑھتی کہ "عوام میں مشہور ہیں" اور خواص اہل تحقیق اس کی سند سے بے خبر ہیں، مثال کے طور پر دیوان خواجہ معین الدین چشتی، دیوان شمس تبریز اور شہزادی زیب النساء مخفی کی طرف منسوب دیوان مخفی وغیرہ' ان دواوین کی اس نسبت سے اہل نظر و اصحاب تحقیق نہ مطمئن ہیں نہ متفق ہیں، معین الدین کاشانی شیعی کا دیوان حضرت خواجہ معین الدین اجمیری علیہ الرحمہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اور صرف منسوب ہی نہیں بلکہ اس کاشانی شاعر کا یہ مشہور قطعہ بھی خواجہ صاحبؒ کے مقبرہ کی دیوار پر کندہ کرا دیا گیا ہے جس طرح گلبرگہ میں حضرت گیسو دراز کے مقبرہ کے ستونوں پر "ناد علی" کا قطعہ کندہ ہے۔

کاشانی شاعر کا وہ قطعہ یہ ہے:

شاہ است حسین بادشاہ است حسین — دین است حسین دین پناہ است حسین
سر داد و نداد دست در دست یزید — حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

اس قطعہ کے تین مصرعے اگر بے چون و چرا مان بھی لیے جائیں تو بھی چوتھے مصرع کا صحیح محمل متعین کرنا مشکل ہوگا کہ اگر لا الٰہ کی بنیاد بقول شاعر حضرت سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے ذریعہ رکھی گئی اور انہیں کی ذات والا صفات بنائے لا الٰہ تھی تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ان سے پہلے کوئی صاحب ایمان اور موحد ہوا ہی نہیں کیونکہ ایمان و توحید کی بنیاد تو حضرت سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رکھی۔

اسی طرح عربی ادب میں بھی حضرت سیدنا علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی طرف منسوب ایک دیوان "دیوان علیؓ" کے نام سے پایا جاتا ہے، لیکن عربی ادب کے محققین کے نزدیک وہ تحقیق واستناد کے معیار پر پورا نہیں اترتا ہے۔ اس موضوعِ خاص سے خصوصی دلچسپی رکھنے والے شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی اپنے رسالہ "ادعیہ پر تحقیقی نظر" کے ص ۱۴ پر لکھتے ہیں:

"سیدنا علی (کرم اللہ تعالیٰ وجہہ) کی طرف ایک دیوان منسوب ہے حالانکہ دسویں ہجری کے شیعہ عالم ملا باقر مجلسی نے "حیات القلوب" میں بارگاہ نبوت کے شعراء کے نام گنائے ان میں سیدنا علی (کرم اللہ تعالیٰ وجہہ) کا نام نہیں ہے۔ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر سیدنا علی کرم اللہ وجہہ صاحب دیوان شاعر ہوتے تو ملا باقر مجلسی انہیں کسی صورت سے بھی ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتے تھے"۔

یہی صورت حال حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معاملہ میں بھی ہے کسی بھی معتبر و مستند ذریعہ سے عربی ادب و شاعری میں ان کا ایک شعر بھی اب تک پڑھنے میں نہیں آسکا ہے، ان کی شاعری کے ثبوت میں لے دے کے یہی ایک عربی مناجات ہے جو صرف اس غلط فہمی کے نتیجہ میں ان کی طرف منسوب ہوگئی اور مشہور کردی گئی کہ مناجات کے آخری شعر میں (جسے آپ چاہیں تو مقطع کہہ لیں) قائلِ مناجات کا نام یا تخلص "صدیق" آگیا ہے، بس اسی مقطع اور تخلص کو بنیاد بنا کر عربی کی کچھ شد بد رکھنے والے کسی صوفی درویش نے اسے سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مناجات سمجھ کر اپنے ورد میں داخل و شامل کر لیا ہوگا اور پھر بے تحقیق یہ انکشاف بھی کر دیا ہوگا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک خاص الخاص مناجات انہیں سینہ بہ سینہ پہنچی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں بھی کہیں سے کوئی مخطوطہ مناجات دریافت ہو گیا ہو اور انسانی نفسیات کی یہ کمزوری بھی بڑی پرانی کمزوری ہے کہ مطبوعات کے مقابلہ میں مخطوطات کو کچھ زیادہ ہی قابل اعتماد و لائق اعتنا سمجھا جاتا ہے۔

پہلے کہیں اشارتاً یہ بات لکھی جاچکی ہے کہ اس مناجات کی بحر، بحر رمل مثمن ہے اور یہ وہی بحر ہے جس میں غالب کی مشہور غزل "سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں" موجود ہے یا یہ مشہور نظم "آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے" بھی اسی بحر رمل مثمن میں ہے۔

راقم السطور کے والد بزرگوار عربی و فارسی اور اردو میں شاعری فرماتے تھے شعر و شاعری میں حضرت اصغر گونڈوی کو اپنا استاذ مانتے تھے اس مناجات سے

متعلق وہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ عربی شاعری میں یہ بحر رمل مثمن عام طور پر مروج و مستعمل نہیں ہے اور خود احقر بھی اپنے محدود مطالعہ کے نتیجہ میں یہی سمجھ سکا ہے کہ عربی شاعری میں یہ بحر یقینی طور پر رواج یافتہ بہرحال نہیں ہے لہذا اگر اہل تحقیق کے نزدیک اب بھی یہی فیصلہ ہے کہ یہ بحر عربی میں مستعمل نہیں ہے تو یہ ایک ایسی بنیادی بات ہوگی جس کی وجہ سے مناجات کی نسبت بدیہی طور پر غلط ثابت ہوجاتی ہے اور پھر اس کا کوئی جواب و معاوضہ مشکل ہی سے ہو سکے گا۔

اور اگر مناجات کی بحر و وزن سے قطع نظر کر کے آگے بڑھیے تو بار بار آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کا ذوق عربیت مجروح ہو رہا ہے لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب آپ بذات خود عربی ادب سے گہرا ربط و تعلق رکھتے ہوں، مناجات میں آئی ہوئی اکثر و بیشتر تعبیرات خالص عجمی ذوق بلکہ ہندوستانی ذوق پر مبنی ہیں۔

مثال کے طور پر مناجات کے پہلے اور چوتھے شعر میں "یا الٰہی" کا فقرہ استعمال ہوا ہے جو بالکل ہندوستانی و عجمی ذوق استعمال کا آئینہ دار ہے، عربی میں عام طور پر مقام ندا میں بھی یا الٰہی کی جگہ صرف "الٰہی" بولتے ہیں، حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ کا مشہور قطعہ ہے، بعض حضرات اسے بعض دوسرے بزرگوں کی طرف منسوب کرتے ہیں ؎

الٰہی عبدک العاصی اتاکا	مقراً بالذنوب وقد دعاکا
فان تغفر فانت لذاک اہل	وان تطرد فمن یرحم سواکا

اس قطعہ کا منظوم ترجمہ بھی ملاحظہ میں رہے، احقر نے کسی وقت یہ ترجمہ کیا تھا ؎

گنہگار بندہ ترے در پہ مولا	گناہوں کا اقرار کر کے خود آیا

جو تو اس کو بخشنے تو ہے اہل تو ہی   توجھڑکے تو پھر کون اس کا خدایا

اسی طرح ایک دوسرا شعر جو قیس عامری مجنوں کی طرف منسوب ہے ؎

الٰھی تبت من کل المعاصی   ولکن حب لیلیٰ لا اتوب

اے خدا میں نے ہر گناہ سے توبہ کرلی ہے   لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کی ہے

(۱) پہلے شعر میں آئے ہوئے لفظ "یا الٰھی" کی عجمیت کو نظر انداز بھی کردیں تو شعر کے دوسرے الفاظ بھی دامنگیر ہوجاتے ہیں، دوسرے مصرع میں ترکیب الفاظ اور اسلوب تعبیر دونوں ہی کھٹکتے ہیں دوسرا مصرع یوں ہے:

مفلس بالصدق یاتی عند بابک یا جلیل

اس مصرع کی ترکیب الفاظ پر غور کیجئے تو بظاہر یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ بالصدق کا تعلق مفلس سے ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ مفلس سے متعلق ہونے کی صورت میں تو بات ہی بگڑ جاتی ہے اس سے تو یہ مطلب سمجھا جائے گا کہ شاعر اپنی سچائی کی وجہ سے مفلس ہے یا سچائی سے تہیدست اور مفلس ہے، اس لیے مناسب بات یہ ہوگی کہ بالصدق کو آگے آنے والے فعل یاتی سے متعلق قرار دیا جائے اور مطلب یہ سمجھا جائے کہ وہ مفلس صدق دلی کے ساتھ آپ کے در پر آیا ہے، اس طرح مصرع کا مطلب تو درست ہوجاتا ہے لیکن لغت و عربیت کی یہ غلطی پھر بھی عجمیت کا ثبوت مہیا کرتی رہتی ہے کہ شاعر نے یاتی (فعل مضارع) کے ساتھ عند کا لفظ استعمال کیا ہے جو خلاف محاورہ و خلاف لغت ہے، مصباح اللغات اور المنجد وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اتی یاتی کا صلہ حرف باء آتا ہے، اتی بالمکان یا اتی بالباب محاورہ ہے اس لحاظ سے اس مصرع میں بھی اتی ببابک یا جلیل ہونا چاہیے تھا۔

(۲) اب دوسرے شعر پر توجہ فرمائیے جس کا پہلا مصرع تو ٹھیک ہے، لیکن دوسرا مصرع یوں ہے:

انہ شخص غریب مذنب عبد ذلیل

اس مصرع میں لفظ شخص اور غریب خالص طور پر عجمیت اور ہندیت کی غمازی کررہے ہیں۔ یہ دونوں ہی لفظ عربی استعمال کے خلاف اردو زبان کے محاورہ کے مطابق استعمال ہوئے ہیں، عربی زبان میں شخص کا لفظ وجود اور مجسمہ یا اسٹیچیو وغیرہ کے مفہوم میں بولا جاتا ہے عربی میں یہ لفظ آدمی کے مفہوم میں یا آدمی کے لیے نہیں بولا جاتا، اسی طرح غریب کا لفظ عربی زبان میں مفلس و فقیر وغیرہ کے مفہوم میں نہیں بولا جاتا بلکہ پردیسی، مسافر اور اجنبی کے مفہوم میں مستعمل ہوتا ہے لیکن مصرع مذکور میں دونوں ہی لفظ اردو محاورہ کے مطابق لائے گئے ہیں، عرب کے "اہل زبان" اس طرح ہرگز استعمال نہیں کرتے۔

(۳) اب مناجات کا پانچواں شعر ملاحظہ ہو:

قل لنار ابردی یارب فی حقی کما   قلت قلنا نار کونی انت فی حق الخلیل

شعر کا ترجمہ یوں کیا جائے گا۔ اے میرے رب آپ میرے حق میں آگ سے کہہ دیجئے کہ تو ٹھنڈی ہوجا جس طرح کہ آپ نے کہا تھا کہ ہم نے آگ سے کہا کہ "اے آگ تو ہوجا" (یہ بات) تو نے حضرت خلیل کے حق میں کہی تھی۔

اس شعر میں بھی "رب" سے پہلے "یا" حرف ندا کا اضافہ کلام عرب میں نہیں ملتا قرآن مجید کی متعدد آیات میں صرف رب کا کلمہ بغیر حرف ندا مستعمل ہے رب انی مغلوب فانتصر" "رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ و من ذریتی" رب انی اعیذ ھا بک و ذریتھا

من الشیطٰن الرجیم، رب اغفر لی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب یا اللہ یارب کہہ کر ندا کا طریقہ عجمی وہندوستانی ہے۔

پھر شعر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آتش نمرود والے واقعہ کی تلمیح میں قرآن مجید کے جس فقرہ کو بطور اقتباس و تلمیح نقل کیا ہے وہ فقرہ ناقص اور ادھورا ہے ترجمہ میں ہم نے اسے خط کشیدہ کر دیا ہے اس فقرہ میں برداً کا لفظ یا اس کا ہم مفہوم کوئی دوسرا لفظ ہونا ضروری تھا۔ مختصر یہ کہ یہ شعر شاعر کے ذوق عجمیت کی غمازی کے ساتھ ساتھ اسکے شاعرانہ عجز کی غمازی بھی کر رہا ہے، چھٹے شعر پر کچھ تبصرہ کتابت و اعراب کی غلطیوں کے تحت (معارف ماہ جون ۱۹۹۶ء) گذر چکا ہے۔ مناجات کا ساتواں شعر حضرت شاہ صاحب کی تضمین و تخمیس کے ساتھ مخطوطہ میں یوں شایع ہوا ہے:

ان توب اللہ مفتاح لابواب الفتوح ؛ انت یا امی غریب تب الیہ کالنصوح

کل من ھو جاء فی الدنیا الی العقبی یروح ؛ این موسیٰ این عیسیٰ این یحییٰ این نوح

انت یا صدیق عاصی تب الی المولی الجلیل

مناجات کا یہ شعر زیر تبصرہ مخطوطہ میں ساتویں نمبر پر درمیان مناجات لکھا گیا ہے اس کے بعد اس مناجات کے چار اشعار اور بھی ہیں حالانکہ اس بند میں اصل شاعر اور اس کے تضمین نگار دونوں ہی کے تخلص بھی موجود ہیں جس کا تقاضا تو یہی تھا کہ یہ بند آخری بند اور مناجات کا یہ شعر آخری شعر ہوتا، ترتیب کی یہ غلطی کس سے اور کیسے ہوگئی اس کی تحقیق ضروری ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب غریب علیہ الرحمہ کی اردو تضمین میں یہ شعر آخری

نمبر پر اور تضمین کے آخری بند میں ملتا ہے بظاہر یہی ترتیب ہونی چاہیے تھی۔

مناجات کے اس شعر میں شاعر نے اپنا نام یا تخلص صدیق نظم کیا ہے، اسی تخلص نے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کیا اور کوئی بزرگوار اسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مناجات سمجھ بیٹھے، جن صاحب کو بھی یہ غلط فہمی ہوئی وہ عربی شاعری سے متعلق ضروری واقفیت بھی شاید نہیں رکھتے تھے نہ تو انہیں یہ خبر تھی کہ مناجات کی یہ بحر عربی شاعری میں مروج و مستعمل ہی نہیں ہے اور وہ اس کھلی ہوئی حقیقت سے باخبر تھے کہ عربی شعرا کے تمام دواوین اور انکے جملہ قصائد و منظومات کا جائزہ لیا جائے تو شعرائے متقدمین کے کلام میں نام یا تخلص کے قسم کی کوئی چیز بھی تلاش بسیار کے بعد بھی شاید ہی مل سکے، عربی کی قدیم شاعری میں تخلص رائج ہی نہیں تھا، اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ بھی بطور خاص قابل لحاظ ہے کہ "صدیق"، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام نہیں تھا بلکہ یہ ان کا لقب تھا جو ان کے مقام صدیقیت کو نظر میں رکھتے ہوئے دیا گیا تھا جو ان کی مدح و تحسین کا ایک مشہور عنوان ہے حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان عبدیت و تواضع ہرگز اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مناجات کے وقت اپنی زبان سے اپنے آپ کو "صدیق" جیسے شاندار لقب سے یاد کریں۔

اس سے یہ بات تقریباً متعین ہو جاتی ہے کہ یہ مناجات کسی دوسرے صدیق کی ہے جو ایسے دور میں ہوئے ہیں جب شاعر کے لیے تخلص کا ہونا اور پھر اسے مقطع میں لانا ضروری سمجھا جانے لگا تھا۔

آگے چل کر مناجات کے نویں شعر میں "یا الٰہی" کا فقرہ پھر آیا ہے، اس شعر کی اعرابی غلطیوں کا ذکر پچھلی قسطوں میں ہو چکا ہے، مناجات کے دسویں شعر پر بھی

گفتگو پہلے ہو چکی ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ مناجات کا یہ شعر مخطوطہ میں غلط طور پر آیا ہے، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی تضمین میں یہ شعر جس طور پر ہے وہ مخطوطہ کے شعر سے بہر حال بہتر اور درست ہے۔

مناجات کے اصل اشعار پر بقدر ضرورت و کفایت تبصرہ ہو چکا ہے اس لیے اس سلسلہ کو مزید طول دینا مناسب نہ ہوگا، مناجات پر تبصرہ کرتے ہوئے اصل ضرورت تو اسی بات کی تھی کہ اس مناجات کی نسبت سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف بالکل غلط اور خلاف حقیقت ہے، ادب عربی کی تاریخ سے ان کا شاعر ہونا ہی ثابت نہیں ہے اور پھر اس مناجات میں لفظی و معنوی لغوی و ادبی ہر طرح کی ایسی امہاتی غلطیوں کے ہوتے ہوئے اسے حضرت موصوف کی طرف منسوب کرنا ان کی تنقیص شان کے سوا کچھ نہیں ہے۔

مناجات کی تضمین میں حضرت شاہ نیاز احمد نیاز علیہ الرحمہ نے جو مصرعے لگائے ہیں ان میں بھی فروگذاشتیں خاصی موجود ہیں جن کی نشاندہی سوء ادب سے خالی نہیں ہے اس لیے سر دست اس تبصرہ کو ختم کیا جاتا ہے لیکن اتنی گذارش میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا کہ جو صاحب ذوق حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے عربی کلام پر تحقیقی کام کے لیے کمربستہ ہوں وہ پہلی محنت اسی کام پر کریں کہ موصوف کا کلام ان فروگذاشتوں سے پاک صاف ہو کر سامنے آجائے۔

رامائن کا ایک قدیم نثری مخطوطہ

از ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی۔ رام پور

رام پور رضا لائبریری اپنے نادر مخطوطات، قلمی تصاویر اور فن خطاطی کے نادر و نایاب نمونوں کے لیے مشہور ہے۔ مخطوطات میں گیتا، رامائن، مہابھارت اور پنچ تنتر کی کہانیوں کے فارسی رسم الخط میں مخطوطے بھی موجود ہیں۔ مذکورہ نسخوں میں ایک نادر نسخہ رامائن کا بھی ہے، اس نسخے کو اخوندزادہ احمد خاں غفلتؔ نے اردو نثر میں تحریر کیا ہے۔ اخوندزادہ احمد خاں غفلت ابن برہان الدین خاں یوسف زئی رامپور کے رہنے والے تھے۔ موصوف قدرت اللہ شوقؔ کے شاگرد ہیں، ان کا ذکر مصحفیؔ نے تذکرۂ ہندی گویان، ریاض الفصحا میں اس طرح کیا ہے:

"جوان مہذب الاخلاق است از آں شہر خود محض برائے ملاقات فقیر در لکھنؤ آمدہ بود در قصائد مثنوی داد معنی ہندی می دہد" (ص ۲۴۳)

انتخاب یادگار میں منشی امیر احمد مینائی غفلتؔ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"تعلی مضامین سے سرزمین سخن کو آسمان بنا دیا، مدح و قدح دونوں میں شعرائے سلف کا رنگ دکھایا۔۔۔ چونسٹھ برس عمر پائی، بارہ سو انسٹھ ہجری میں یکم ذی حجہ کو رحلت فرمائی، مسودہ انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہاتھ آیا، وقت مطالعہ ہر رنگ میں ان کی طبع رسا کو قادر پایا۔"

اخوندزادہ احمد خاں غفلت کا تذکرہ دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی کیا ہے، غفلت کی رامائن کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے رام چرتر مانس، بالمیکی رامائن، ادھیاتم رامائن یا کسی دوسری رامائن کو سامنے رکھ کر ترجمہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ رام چندر جی کی حیات کے جو واقعات زبان زد خواص و عوام ہیں انہیں بنیاد بنا کر طبع زاد طریقے پر یہ رامائن لکھی گئی ہے، اس لیے اس میں جدت و ابداع کی ایک فضا پیدا ہو گئی ہے، ادھیاتم رامائن چودہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی اور برہمانڈ پران کا ایک جز سمجھی جاتی ہے۔ اس میں سات کانڈ ہیں۔ غفلت نے کانڈوں کی تقسیم اپنے طور پر کی ہے۔ ویسے مشہور واقعات مثلاً راجہ دسرتھ کا لاولد ہونا، رام چندر جی کا بن باس، تاڑکا کا قتل، سیتا جی کا ہرن وغیرہ سب واقعات موجود ہیں۔

غفلت نے یہ رامائن نواب احمد علی خاں والی رام پور کے حکم پر لکھی تھی جیسا کہ انہوں نے خود لکھا بھی ہے:

"حسب الطلب سرکار آستان رفیع المکان فلک نشان پر سیح وار سعود کیا[1] تو یہ فرمان آیا کہ غفلت اس نسخے کو زبان اردو میں تحریر کر کی شتاب موقف عرض میں پہنچا۔ اس ارشاد سے سر افتخار آسمان پر پہنچایا۔"

چونکہ یہ رامائن ایک مسلم حکمراں کے حکم پر لکھی جا رہی تھی اور اس کے اکثر قارئین فارسی اور اردو داں طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کا کوئی مذہبی لگاؤ بھی رامائن سے نہیں تھا اس لیے دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے داستانی فضا قائم کرنا ضروری تھا چنانچہ پوری رامائن کی خصوصیت یہ ہے کہ قاری واقعات کو دلچسپی کے ساتھ پڑھتا چلا

---

[1] معارف: صحیح صعود ہے۔

جاتا ہے اور بعض سطور اور واقعات اسے غور و فکر کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں۔ اس فضا کو قائم کرنے میں کوئی واقعہ مذہبی تاریخ کی روشنی میں غیر محقق نہیں ملتا۔ اس طرح یہ رامائن مذہبی تاریخ کی روشنی میں مشہور واقعات پر مبنی ہے۔ فضا داستانی ہے اسی لیے اس کا نام "فسانہ رام و سیتا موسوم بہ ظفر کام" رکھا جس میں قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے، یہ اپنے زمانہ کی نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ رامائن رام پور رضا لائبریری کے قلمی مخطوطات اردو کے رجسٹر قصص و داستان کے تحت ۲۸۷ پر مندرج ہے، اس کے دو نسخے ہیں، ایک نسخے کا سائز "۸ × "۵ ہے ½۱ کا پشتہ پڑا ہوا ہے جو محفوظ کرنے کے خیال سے ڈالا گیا ہوگا۔ سیاہ روشنائی (جو وقت کے ساتھ ہلکی پڑ چکی ہے۔) استعمال کی گئی ہے۔ ہر کانڈ کی ابتدا میں عنوانات سرخ روشنائی سے تحریر کیے گئے ہیں۔ مخطوطے کے مختلف صفحات پر ضرورت کے مطابق الفاظ کو کاٹ کر تصحیح کی گئی ہے، مثلاً "آغاز داستان" کے عنوان کے تحت پہلی سطر میں اس طرح تصحیح ہے:

"خامہ دہر نکتہ اس مہد کاغذ میں یوں تکلم کرتا ہے۔"

قرطاس کو کاٹ کر "مہد کاغذ" تصحیح کی گئی ہے، اس لیے اغلب یہ ہے کہ یہ تصحیح شدہ نسخہ بنیادی نسخہ ہے۔ اس لیے آئندہ اسے بنیادی نسخہ کہا جائے گا، "بنیادی نسخے" کا کاغذ بادامی، موٹا، کھردرا اور ہاتھ کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے اور غالباً وقت گزر جانے کی وجہ سے اس پر پیلے اور مٹیالے پن کا اثر نمایاں ہے۔ "فسانۂ رام و سیتا بہ ظفر کام" کا ایک دوسرا نسخہ بھی فہرست میں ۲۸۸ پر مندرج ہے، اس کا سائز بنیادی نسخے سے کچھ بڑا ہے۔ کاغذ بادامی، گھوٹا کیا ہوا، چکنا ہے۔ اس پر کوئی

کٹنگ یا تصحیح نہیں ہے۔ اس لیے یہ پہلے نسخے کی نقل ہے۔ میں نے بعض صفحات کا تقابل کیا، اس کی بنیاد پر بھی یہ دعویٰ درست ہے کہ دوسرا نسخہ بنیادی نسخے کا صاف کیا ہوا مسودہ ہے۔ اس لیے اسے 'دوسرا نسخہ' کہا جائے گا۔

بنیادی نسخہ: اس کی ابتدا 'بسم اللہ' سے کی گئی ہے اور حمد و ثنا کے بعد یہ تحریر ہے:

"حق سبحانہ تعالیٰ وہ معبود ہی کہ اگر اوسکو سجود کیجیے تو مانند آفتاب کی پیشانی نورانی نظر آوی"

ساڑھے تین صفحات میں یہ حمد ہے، اس کے بعد نعت سرور کائنات چار صفحات میں ہے، اس کے بعد نواب احمد علی خاں والی رام پور کی تعریف میں نظم ہے ؎

زبس کہ خود سخاوت سی تیری زمانہ میں   ہر ایک ہے مالک ملک اور صاحب اقبال

اس کے بعد سبب تالیف ہے اور پھر اصل رامائن شروع کی گئی ہے:

"خامہ دہر نکتہ اس مسیحا نفس مہد کاغذ میں یوں تکلم کرتا ہے کہ شہر اودھ میں جسرت نام کا ایک راجہ ملک و مال در و جواہر فوج و لشکر میں لاثانی اور سند سے لے کر بنگال تک اوسکی حکمرانی صاحب عدل و انصاف دلاور سرد و صاف باغ وجود اوسکا بہار عشرت سی شاداب لیکن مانند سرو بے ثمری سے دل پر تاپ سب خوشی خرمی ہستی کے اوسکو رنج و غم سی زیادہ تھی اور ریاست فقیری سی بہتروں کو حسرت سی خلق کا مونہہ تکتا اور رات کو شام سی صبح تلک تارے گنتا اور آنسو سے رومال کو تر کرتا ... سکی اولاد ہے ایک اپنی قسمت میں نہیں۔"

ان دونوں نسخوں میں یائے معروف اور یا مجہول کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ گاف (گ) کی جگہ 'ک' کاف کا استعمال کیا گیا ہے اور 'ر' کی جگہ 'ل' کا استعمال کیا گیا ہے:

"گنگاری کنکا جی کے ایک مندل میں کسی دیوتا کے سامنے" دشرت کو جسرت اور مشورہ کو مشورت لکھا گیا ہے یعنی دال کی جگہ جیم اور 'ہ' کی جگہ 'ت' کا استعمال کیا گیا ہے۔

سات کانڈوں کی جگہ غفلت نے مذکورہ نسخوں میں کانڈوں کو اپنے طور پر ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ان کے عنوانات قائم کیے ہیں۔ مثلاً:

"بیان کرنا بسوامتر کا احوال سیتا اور عاشق ہونا رام کا۔"

"بیچل نا زاہد کا رام کو بک سو منبر میں شتر نیکہ طرف۔"

"ملاقات کرنا جنگ سے اور کھینچنا کمان۔"

بنیادی نسخے کے صفحات کا مسطر ایک جیسا نہیں ہے، بعض جگہ تیرہ سطور تحریر کی گئی ہیں بعض جگہ بارہ سطور اور بعض جگہ پانچ سطور تحریر کی گئی ہیں، نسخے کے اختتام پر تاریخ درج ہے:

فسانۂ رام و سیتا کا جو غفلت   ہوا اک ماہ کے عرصے میں اتمام
زبس تھا ذکر فتح شہر لنکا   کہی تاریخ ہاتف نے ظفر کام
۱۲۴۱

اس نسخے پر کتب خانہ کی مہر ہے جس پر تحریر ہے:

"ہست ایں مہر بر کتبخانہ والی رام پور فرزانہ"

یہ رامائن کا ایک قدیم مخطوطہ ہے اور اگر اس کی اشاعت ہو تو قومی یک جہتی کی ایک نشانی قائم ہوگی کہ اپنے زمانۂ عروج میں مسلم حکمرانوں نے اپنے اہل وطن کے مذاہب کی کتب تحریر کرا کر ان کے مذہب کا احترام بھی کیا اور اسے پڑھنے اور دوسروں کو پڑھوانے کی کوشش بھی کی۔

اخبار علمیہ

دمشق کے مشہور علمی ادارہ مجمع اللغۃ العربیہ کا قیام دار المصنفین کے قیام کے چند سال بعد یعنی ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا، اس کا اصل اور قدیم نام مجمع العلمی العربی ہے، اس کا سہ ماہی علمی مجلہ قریباً پون صدی سے تحقیق و تنقید اور عربی زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہے اور اپنے بلند پایہ مقالات و مضامین کی وجہ سے نہایت قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، عالم عرب کا یہی ایک ایسا علمی رسالہ ہے جو پابندی سے ہمیں موصول ہوتا ہے، ۹۵ء کے شماروں میں الاخبار الطوال لابی حنیفہ الدینوری، اخبار المجنون القدیمہ بین المخطوط والمطبوع من رحلۃ ابی بطوطہ، دراسۃ حدیثۃ فی الوبیات، کتاب فی تحدید المصطلحات النحویہ، رحلۃ الطرد والصید جیسے وقیع اور پُر از معلومات مقالات شامل ہیں۔ مجلہ کے ایک کالم سے جدید عربی مطبوعات کی ایک جھلک بھی ملتی ہے جیسے حلب کے معہد التراث العلمی العربی نے تاریخ العلوم عند العرب کے موضوع پر ایک مجموعہ مقالات اور عبد الوہاب صابونی کی عیون المولفات کو شایع کیا، قاہرہ کے مکتبہ خانجی سے مقدمہ تفسیر ابن النقیب بیروت سے مسند ابوعوانہ الاسفرائینی اور برہان الدین البقاعی کی القول المفید فی اصول التجوید کو تصحیح و تعلیق کے بعد شایع کیا گیا، شام کی وزارت ثقافت

نے بھی بعض مفید کتابیں جیسے معجم القاب ارباب السلطان فی الدول الاسلامیہ اور قاموس الفکر السیاسی شایع کیں خود مجمع اللغۃ العربیہ نے ابن عساکر کی تاریخ مدینۃ دمشق کے علاوہ کشف المشکلات وایضاح المعضلات اور ابن اللبودی کی النجوم الزواھر فی معرفۃ الاواخر شایع کیں، لیکن سب سے زیادہ خوشی اندلس مرحوم کے شہر میڈرڈ سے شایع ہونے والی کتابوں کے نام دیکھ کر ہوئی جن میں الخشنی کی اخبار الفقہاء والمحدثین، ابن زہر کی کتاب الاغذیہ، ابن حبیب کی مختصر فی الطب اور کتاب التاریخ، ابن بشکوال کی کتاب المستغیثین باللہ تعالیٰ وغیرہ ہیں۔

اسلامی علوم و فنون کی داستان علم طب کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا یہ روشن باب ہے، مسلم حکومتوں کے ادبار سے اس فن پر بھی زوال کا سایہ آیا اور جدید طب کی گرم بازاری میں طب مشرق نے گویا اپنی دوکان بڑھادی، اب اس کے احیاء و ارتقاء میں سب سے نمایاں و درخشاں نام جناب حکیم محمد سعید کا ہے، جنھوں نے مسلسل اور انتھک کوششوں سے پاکستان میں فنی لحاظ سے ہمدرد دواخانہ کو دوا سازی میں معراج کمال پر پہنچایا اور علمی لحاظ سے بیت الحکمت قایم کر کے مجدد طب ہونے کا بجا طور پر حق حاصل کیا، حال ہی میں اس ادارہ کے اہم انگریزی مجلہ HAMDARD MEDICUS کا تازہ شمارہ موصول ہوا، یہ رسالہ قریب ۳۹ سال سے شایع ہو رہا ہے اور اب اس کا شمار فن طب کے چند بلند پایہ بین الاقوامی مجلوں میں ہوتا ہے، اس کی مجلس ادارت میں پاکستان کے ممتاز ماہرین فن کے علاوہ امریکا، پولینڈ، جاپان، جرمنی، فرانس

اور کناڈا کے حکما و علمائے طب شامل ہیں، ہمارے جناب حکیم عبدالحمید دہلوی کا نام
نامی بھی اس فہرست کی زینت ہے، زیر نظر شمارہ انتالیسویں جلد کا پہلا شمارہ ہے
اور اس میں ابن الدینوری کی کتاب النبات کا تعارف فاضل جلیل ڈاکٹر حمید اللہ
کے قلم سے ہے، اس کے علاوہ نباتات اور جڑی بوٹیوں پر کئی اہم مضامین ہیں، جناب
حکیم محمد سعید اور ان کے رفقاء کی مرتب کردہ انگریزی کتاب MEDICAL HE-
RBAL کی پہلی جلد کا تعارف بھی ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے، اس کتاب
یا ہمدرد میڈیکس یا بیت الحکمت کے سلسلہ میں اگر ہندوستان کے حکما و اطبا تجاویز
و مشورے پیش کرنے کے خواہش مند ہوں تو مندرجہ ذیل پتہ پر مراسلت کر سکتے ہیں،
محمد بن قاسم ایونیو، پی او، مدینۃ الحکمت، کراچی، ۷۴۶۰۰ پاکستان۔

انسان کے ذوق تجسس کا دائرہ محدود ہوتے ہوئے بھی کس قدر لامحدود ہے،
تسخیر سموات و نباتات سے تسخیر حیوانات تک! اب ایک تازہ محققین کے مطابق
یہ معلوم ہوا کہ دیومالائی گنیش کی قدیم سواری یعنی ساکن سوراخ و بل چوہے نے
اس عالم آب و گل میں ۹ لاکھ سال پہلے سب سے پہلی بار شمالی ہند میں آنکھیں کھولیں،
فرانس کی یونیورسٹی آف مانٹ پلیرا اور پاسٹیر انسٹی ٹیوٹ نے میدانی چوہوں کی اصل
نسل کی تلاش و تحقیق کا بیڑہ اٹھایا، اس مہم میں چند ایرانی، پاکستانی اور ہندوستانی
سائنسداں بھی شریک ہوئے، مکمل تحقیق جرنل آف ایولوشنری بائیولوجی میں جلد
ہی شائع ہوگی، لیکن فرانس کے مشہور اخبار LE MONDE نے اس مہم کے متعلق
ایک مختصر روداد شائع کی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے ان سائنسدانوں
نے میدانی چوہوں کے توالد و تناسل کے تغیر و تبدل پذیری کے مطالعہ پر خاصا وقت

صرف کیا، ایران و برصغیر کے چوہے ان کے مطالعہ کا مرکز بنے، سالماتی حیاتی تجزیہ
کے طریق کار اور ڈی این اے کے خاص ذرائع کی مدد سے حیاتین کی باریکیوں کا تجزیہ
کیا گیا جس میں خاص طور پر یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ ماں سے اولاد غیر نرینہ میں کس طرح کے
نسلی اثرات منتقل ہوتے ہیں، اس نہایت باریک اور جدید ترقی یافتہ طریقہ تحقیق
کے ذریعہ میدانی چوہوں کے ارتقاء و نمو پر حیرت انگیز باتیں سامنے آئیں، زیر تجزیہ
چوہوں کی نسلی خصوصیات کا موازنہ یوریشیا اور شمالی امریکہ کے چوہوں سے کیا گیا،
گو چوہوں کے سب سے قدیم اور معلوم نمونہ کے متعلق یہ پہلے بھی فرض کیا جا چکا ہے
کہ سات لاکھ سال پہلے چوہوں کی پیدائش و افزائش سب سے پہلے ہندوستان ہی
میں ہوئی تھی، لیکن اس تازہ تحقیق سے دو لاکھ سال کی اور قدامت ثابت ہوتی ہے،
شمالی ہند کے چوہوں کے متعلق یہ بھی بتایا گیا کہ ان میں توالد کی صلاحیت سب سے
بڑھ کر ہے اور ان چوہوں میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو دنیا کے مختلف
علاقوں کے چوہوں میں جزوی طور پر پائی جاتی ہیں، جوں جوں یہ چوہے اپنے
اصل مولد سے دور ہوتے گئے، ان کی صلاحیتیں بھی محدود ہوتی گئیں، دلچسپ
بات یہ ہے کہ شمالی ہند سے نکل کر یہ چوہے ایشیا، یوریشیا، مغربی ایشیا
اور شمالی افریقہ میں نوآبادی قائم کرتے گئے۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں
مختلف اقسام کے چوہے ہیں جو اپنے خاص علاقہ کے علاوہ اور کہیں نہیں پائے
جاتے مگر ہندوستانی چوہا ہر جگہ موجود ہے، یہ بھی دیکھا گیا کہ تصرف و تبدیلی
کی صلاحیت سب سے زیادہ اسی میں ہے، اس کی غیر معمولی شرح پیدائش اور چھوٹے
قد نے اس کو محفوظ و باقی رکھنے میں بڑی مدد کی ہے۔

انسان کے حوصلہ اور ولولہ کی داستانوں میں ہمیشہ اضافہ کی گنجائش رہتی ہے، اس کی تازہ مثال بنکاک تھائی لینڈ کا ایک عظیم الشان ہوٹل 'رائل ڈریگن' ہے، یہ طول و عرض میں فٹ بال کے آٹھ میدانوں کے برابر ہے، ۴۴ر۳ر۲ ہیکٹیر پر یہ بنکاک کے مضافات میں تعمیر کیا گیا ہے اور اب اسے گنیس بک آف ریکارڈس کے مطابق دنیا کے سب سے بڑے ریستوران ہونے کا اعزاز حاصل ہے، چند سال پہلے بھی یہ اعزاز بنکاک کے ایک ہوٹل تھائی لینڈ پیلس کو حاصل تھا جو ۲۷ر۲ ہیکٹیر پر قائم تھا، رائل ڈریگن میں ۱٫۲۰۰ ملازم ہیں، ان میں ۳۲۲ خانساماں اور ۵۴۱ بیرے ہیں جو دور دراز باورچی خانہ سے گاہکوں تک پھسلنے والی گاڑیوں ROLLER SKATE کے ذریعہ کھانا پہنچاتے ہیں، نئے بیروں کو ذمہ داری سنبھالنے سے پہلے ان خاص گاڑیوں پر ماکولات و مشروبات لے جانے کی ایک مہینہ تک خاص تربیت دی جاتی ہے، اسکیٹنگ کی وجہ سے یہ کام دلچسپ بھی ہے اور خاصا دشوار بھی، کھانے کی فہرست میں ایک ہزار متنوع کھانے ہیں جو زیادہ تر مغربی، تھائی، جاپانی اور چینی اقسام پر مشتمل ہیں، ان کے علاوہ سمندری غذا قریب ایک ہزار کلوگرام روزانہ مہیا کی جاتی ہے، ہوٹل میں پانچ ہزار نشستیں ہیں، باورچی خانہ میں ساڑھے چوبیس ہزار پلیٹیں اور ساڑھے اکیس ہزار پیالے ہیں، خاص موقعوں پر تین ہزار کھانے صرف ایک گھنٹہ میں تیار کیے جاسکتے ہیں، قریب دو ہزار لوگ روزانہ آتے ہیں لیکن ہفتہ کی تعطیل کے دن تمام نشستیں پر ہو جاتی ہیں، ہوٹل میں

ایک نہایت وسیع اور خوبصورت تالاب بھی ہے جو مچھلیوں اور خوبصورت ہنسوں سے لبریز رہتا ہے، اس تالاب پر کئی پل ہیں، ایک بل کھاتا پل ہے، اس میں نو موڑ ہیں، یہ شاید اس قدیم چینی روایت کی رعایت ہے جس کے مطابق نو موڑ والے پل کو پار کرنا باعث برکت سمجھا جاتا ہے، لذت کام و دہن کی مکمل سیری کے علاوہ چشم و گوش کی مدارات کے سامان کا ذکر ہی کیا، ہوٹل کے مالک خود چینی نژاد ہیں، ان کا کہنا ہے کہ "صرف ایک بار پیدا ہونا ہے تو پھر بے نظیر اور عدیم المثال کام کیوں نہ کیا جائے"۔

سرمایہ داروں کی ہوس زر کی یہ مثال بھی ملاحظہ ہو، بمبئی کے ایک ادارہ کی پروفیسر مسز ملیشا ڈیکھولکر نے اپنی تازہ انگریزی تصنیف "دی ہسٹری آف انڈیاز فریڈم اسٹرگل ان برٹن" میں یہ حیرت انگیز انکشاف کیا ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے دوران بال گنگا دھر تلک نے محسوس کیا کہ آزادی کے خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے کے امکانات ہندوستان سے زیادہ برطانیہ میں ہیں اور اس کے لیے خود انگریز سیاست دانوں کا تعاون ضروری ہے لیکن ان کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لیے سکوں کی کھنک ناگزیر ہے چنانچہ انہوں نے دی انڈین پولیٹکل ایجنسی کے ذریعہ لیبر پارٹی کے سیاستدانوں کو قریب پانچ ہزار پونڈ کی رقم دی، نتیجہ میں بقول مصنفہ انڈیا آفس اور پارلیمنٹ میں ہوم رول کی حمایت میں انگریز دانشوروں کی آوازیں گونجنے لگیں۔

ع۔ص۔

وفیات

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

گذشتہ مہینہ سفر میں جب مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے انتقال کی خبر ملی تو بڑا دھکا لگا، مجھے ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت سے محرومی کا ہمیشہ بہت ملال رہے گا۔

اعظم گڈھ کے متعدد علما کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی، خود مبارکپور کے جو اعظم گڈھ کا مشہور قصبہ اور علم و تعلیم اور صنعت و حرفت کا بڑا مرکز ہے، مولانا عبدالرحمن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی اور مولانا عبیداللہ رحمانی شارح مشکوٰۃ المصابیح کا آوازہ شہرت عالم اسلام میں بلند ہے، انہی لوگوں کی صف میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے بھی اپنی جگہ بنالی تھی، مگر افسوس کہ دست اجل نے انہیں ہم سے چھین لیا، یہ بڑا علمی سانحہ ہے اور قاضی صاحب کا خلا پر ہونا آسان نہیں۔

ان کی ولادت ۱۹۱۶ء میں ہوئی، ان کے نانا مولانا احمد حسین رسولپوری عربی زبان و ادب کے ماہر اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے، قاضی صاحب نے ان کا عربی دیوان مرتب کر کے شائع کیا تھا، انہوں نے عرصہ دراز تک ڈھاکہ میں مسند درس کو رونق بخشی، انہی سے قاضی صاحب نے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں تھیں، پھر مبارکپور کے مشہور مدرسہ جامعہ احیاء العلوم میں درسیات کی تکمیل کی اور جامعہ قاسمیہ مراد آباد میں مولانا فخرالدین، مولانا سید محمد میاں اور مولانا سید اسماعیل سنبھلی سے صحاح ستہ کا درس لیا۔

طالب علمی کے زمانے میں ان کو شعر و سخن سے دلچسپی تھی، اور خود بھی مشق سخن فرماتے تھے، یہ تحریک آزادی کے شباب کا زمانہ تھا، قاضی صاحب کو عملی سیاست اور ہنگامہ آرا قومی جد و جہد سے کبھی سروکار نہیں رہا، تاہم آزادی کا جادو

ہر شخص پر چل گیا تھا، قاضی صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، مبارکپور میں ہر قسم کے مذہبی و سیاسی جلسے برابر ہوتے تھے جن کے لئے وہ نظمیں کہتے تھے، مگر قدرت نے ان کو اس سے اعلا و ارفع کاموں کے لئے پیدا کیا تھا، جب علم و فن سے ان کا اشتغال بڑھا تو شاعری کا کوچہ خود بخود چھوٹ گیا۔

صغر سنی ہی سے مضمون نگاری بھی کرنے لگے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد صحافت کے پیشہ سے وابستہ ہوئے، آزادی سے پہلے زمزم لاہور سے نکلتا تھا جو اس دور کا مشہور قوم پرور اخبار تھا، قاضی صاحب اس کے اور دوسرے اخباروں کے شعبہ ادارت سے منسلک رہے، یہیں "زندہ دلان پنجاب" کی صحبت یسر آئی جس سے زبان کے نوک پلک درست کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی اور لکھنا پڑھنا ہی زندگی کا معمول بن گیا۔

ملک کی تقسیم کے بعد انہوں نے بمبئی کا رخ کیا جو ہندوستان کا سب سے بڑا اور مشہور تجارتی شہر ہے، لوگ یہاں مادی منفعتوں کی طلب اور اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے آتے ہیں لیکن قاضی صاحب اپنے علم و فن کی دوکان سجانے کے لئے یہاں آئے تھے ؎

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

یہی ہنگامہ خیز شہر ان کی علمی، قلمی اور تصنیفی جولان گاہ بنا، اس کے ایک حجرہ میں بیٹھ کر انہوں نے اپنے علم و ہنر کا تازہ جہاں آباد کیا، شب و روز مطالعہ میں مستغرق رہتے، نہ اپنے آرام و راحت کا خیال، نہ کھانے پینے کی پروا، نہ سونے جاگنے اور اٹھنے بیٹھنے کا کوئی وقت، بمبئی کے ہنگاموں اور لوگوں کے ملنے جلنے سے گریز کر کے صرف علم کی خدمت و اشاعت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لینا اور علم کے لئے اپنے وجود کو گھلا ڈالنا آسان نہ تھا مگر انہوں نے یہ سب کر دکھایا اور "پے علم چوں شمع باید گداخت" کا نمونہ پیش کیا، جس کا آج کل کے آرام طلب اور تن آسان لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

یہاں بھی صحافت ہی سے وابستہ رہے، مختلف اخباروں میں مخصوص کالم
لکھتے رہے۔ انقلاب میں کالم لکھنے کا سلسلہ بمبئی چھوڑنے کے بعد بھی جاری رہا۔
یہاں انجمن اسلام کے اسکولوں میں طلبہ کو دینیات کا درس بھی دیا۔ انجمن
خدام النبی نے جب البلاغ کے نام سے ایک علمی، دینی اور حج سے متعلق معلوماتی
رسالہ نکالا تو گو اس پر دوسرے لوگوں کے نام بھی ہوتے تھے، مگر اصلاً اس کی
ترتیب و ادارت کا کام وہی تنہا انجام دیتے تھے، اور اس کے اکثر مضامین بھی انہی
کے قلم سے ہوتے تھے، اس کے ایک مستقل کالم "مطالعات و تعلیقات" میں وہ
اپنے مہینہ بھر کے مطالعہ کا نچوڑ پیش کرتے تھے، جس کے بعض مفید حصے کتابی
صورت میں بھی شائع ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے البلاغ کا ایک خاص شمارہ
تعلیمی نمبر نکالا جو ایک علمی دستاویز بن گیا اور بہت پسند کیا گیا۔

وہ بڑے زود نویس تھے، اس زمانے میں بھی ان کی بعض کتابیں اور رسالے
شائع ہوئے مگر شروع میں ان پر صحافت کا رنگ غالب تھا، بمبئی میں جب علمی
انہماک بڑھا اور تحقیق و جستجو کے عادی ہوئے تو ان کا طرز تحریر بھی بدلا اور تحریر
میں بھی پختگی پیدا ہوگئی، وہ علامہ شبلی مرحوم کے ہمیشہ عقیدت مند رہے، ان کے
نزدیک اردو انشا پردازی کا بہترین اور اعلاترین نمونہ انہی کا طرز تحریر تھا، اس لئے
انہوں نے اسی انداز انشا کی تقلید کی۔ اسی زمانے میں معارف میں ان کے علمی و
تحقیقی مضامین نکلنے لگے جس کا سلسلہ مدۃ العمر قائم رہا۔

۱۹۵۸ء میں ان کی کتاب رجال السند والہند شائع ہوئی تو ملک و بیرون
ملک کے علمی حلقوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، یہ ساتویں صدی سے قبل کے
ہندوستانی و سندھی اصحاب علم و کمال کا تذکرہ ہے، ۱۹۷۸ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن
بڑے اضافوں کے ساتھ دو حصوں میں شائع ہوا، پہلے حصہ میں ان اشخاص کا تذکرہ ہے
جو یا تو ہند و سندھ میں پیدا ہوئے اور یہیں وفات پائی یا جن کا اصل تعلق اسی
سرزمین سے تھا مگر ان کی ولادت اور سکونت باہر رہی، دوسرے حصہ میں باہر سے

یہاں آکر واپس چلے جانے یا باہر سے آکر یہاں قیام پذیر اور یہیں کی خاک کا پیوند
ہونے والوں کا تذکرہ ہے، سیر، تاریخ، رجال، تراجم اور طبقات کی سینکڑوں کتابوں
کو کنگھال کر یہ معلومات جمع کئے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب ہندوستان کے
مسلمانوں کی علمی تاریخ اور عربی طبقات و تراجم میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔

بمبئی میں انہوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا باقاعدہ نظام بنایا تو ہندوستان
کے ابتدائی قدیم عہد کی اسلامی تاریخ ان کا خاص موضوع بن گیا۔ دراصل اردو میں
سب سے پہلے علامہ شبلی نے اپنے بعض مضامین میں اس موضوع پر بحث کی، پھر
مولانا سید سلیمان ندوی نے عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہازرانی لکھ کر
اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے راہ ہموار کر دی، دارالمصنفین کی کتاب
"تاریخ سندھ" اور "ہندوستان عربوں کی نظر میں" بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، قاضی
صاحب نے اس موضوع کو اپنایا تو اس کو مزید وسعت دی، جس سے اس کے بعض
نئے گوشے اور پہلو سامنے آئے، اس سلسلہ کی کتابوں کے نام یہ ہیں:

عرب و ہند عہد رسالت میں۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، اسلامی ہند
کی عظمت رفتہ، خلافت راشدہ اور ہندوستان، خلافت امویہ اور ہندوستان، خلافت
عباسیہ اور ہندوستان۔

گو یہ ساری کتابیں ایک ہی طرز کی ہیں مگر قاضی صاحب کی محنت و کاوش
سے میر انیس کے بقول ان کا حال یہ ہو گیا ہے کہ ؎

اک پھول کا مضمون ہو تو سو طرح سے باندھوں

یہ ساری کتابیں بہت مقبول ہوئیں اور ان کے عربی ترجمے بھی شائع ہوئے،
بعض کتابوں کا ترجمہ مصر کے ڈاکٹر عبدالعزیز عزت عبدالجلیل نے کیا ہے۔

ہندوستان میں پورب کا علاقہ جو پہلے سرکار جون پور میں شامل تھا بڑا زرخیز
اور شیراز ہند کہلاتا ہے، شرقی سلاطین کی علوم و معارف پروری نے اس کے ہر
قریہ کو فردوس کے مانند اور ہر قصبہ کو شیراز و اصفہان کا ہم سر بنا دیا تھا،

قاضی صاحب نے دیار پورب کی علمی تاریخ کو بھی اپنا موضوع بنایا اور یہاں کے قعر گمنامی میں پہنچ جانے والے علما کو اس سے نکالا۔ مضامین کے علاوہ اس موضوع پر ان کی کتابیں "دیار پورب میں علم و علما" اور "تذکرہ علمائے مبارکپور" بھی اہم ہیں۔ تدوین سیر و مغازی، مآثر و معارف اور بنات اسلام کی علمی خدمات بھی بڑی کد و کاوش کا نتیجہ ہیں۔

ان کی ایک کتاب "علی و حسین" بھی ہے جو جناب محمود احمد عباسی کی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" کا جواب ہے۔ اس میں قاضی صاحب نے دکھایا ہے کہ عباسی صاحب نے اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لئے یا تو کمزور تاریخی روایتوں کا سہارا لیا ہے یا روایتوں میں کتر بیونت کی ہے۔ یہ خیال بجا ہے لیکن دوسری طرف حضرت معاویہ و یزید بلکہ بنی امیہ کے مثالب میں جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ بھی ضعف، وہن اور نکارت سے خالی نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ کوئی صاحب علم و نظر اس دور کی دونوں طرح کی روایات کی چھان پھٹک کر کے دودھ اور پانی کو الگ الگ کردے، ہمارے خیال میں ہمارے فاضل دوست پروفیسر یسین مظہر صدیقی ندوی یہ کام بہتر انداز سے کر سکتے ہیں۔

قاضی صاحب نے ان دو نادر و نایاب کتابوں کے متون تحقیق و تخریج کے بعد شائع کئے ہیں۔

جواہر الحدیث فی علم حدیث الرسول اور دیوان احمد (قاضی صاحب کے نانا کا کلام)

ان کی کئی کتابیں شائع ہونے سے رہ گئی ہیں۔ ان میں "مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم و علما" بڑی اہم اور اچھوتی ہے۔

جب بمبئی چھوڑ کر اپنے وطن میں فرد کش ہوئے تو مختلف اداروں نے ان کو اپنے یہاں بلانا چاہا مگر کبر سنی اور عائلی زندگی کے لطف و لذت کو چھوڑ کر کہیں پسند نہیں کیا۔ تاہم دارالمصنفین کا اعزازی رفیق اور اس کی وقف کمیٹی کا ممبر بننا قبول کرلیا۔ ماہنامہ برہان دہلی کے اعزازی مدیر اور شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائرکٹر بھی ہوگئے تھے۔ جہاں سے ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ بہت سے علمی و تعلیمی اداروں کے ممبر بھی تھے۔ جن میں دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو اور دارالعلوم دیوبند قابل ذکر ہیں۔

قاضی صاحب کی بے لوث علمی خدمت اور غیر معمولی جاں فشانی کی بنا پر انہیں علمی و دینی وجاہت کی طرح دنیاوی وجاہت اور مادی فارغ البالی بھی حاصل ہوئی۔ ان کی عربی خدمات اور علمی و تحقیقی کاموں کے اعتراف کے طور پر سابق صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے انہیں توصیفی سند عطا کی۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں پاکستان گئے تو وہاں بھی علمی خدمات کی بنا پر انعام و اکرام سے نوازے گئے۔ قاضی صاحب نے سندھ پر جو قابل قدر کام کیا ہے اس کی بدولت وہاں ان کی پانچ کتابوں کے افتتاح کی تقریب ہوئی جس کی صدارت اس وقت کے وزیر اعلا سندھ نے کی اور "محسن سندھ" کا خطاب بھی دیا۔

قاضی صاحب بڑے متواضع، منکسر المزاج اور خلیق تھے۔ وہ خلوص و محبت اور دردمندی کا پیکر تھے۔ لوگوں کی حاجت روائی اور ان کے کام کر دینے میں ان کو لذت ملتی تھی۔ کسی کو ضرر پہچانا یا ایذا دینا ان کا شیوہ نہ تھا۔ ان کی زندگی بڑی سادہ اور ہر قسم کے تکلف و تصنع سے بری تھی۔ اپنی وضع قطع اور ملنے جلنے کے انداز سے اپنی عظمت اور بڑائی ظاہر نہ ہونے دیتے۔ طبیعت میں غیرت و خودداری تھی۔ کسی کا احسان مند ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ کسی کے عہدہ و منصب اور جاہ و تمول سے نہ کبھی مرعوب ہوتے اور نہ اس سے دب کر اور جھک کر ملتے۔ اہل علم کی بڑی قدر کرتے۔ ان کے سامنے مصنوعی اور خودساختہ بڑوں کو ہیچ و حقیر خیال کرتے، علم کی توہین کسی حال میں نہ ہونے دیتے۔ اصحاب علم کو دولت مندوں اور امرا کی خوشامد کرتے دیکھتے تو غضب ناک ہو جاتے۔ بڑے صاف گو تھے۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا، لاگ لپیٹ، رو رعایت، ظاہر داری اور مصلحت پسندی انہیں نہیں آتی تھی، ناگوار باتوں اور غلط کاموں کو دیکھ کر چپ رہنے یا چشم پوشی کر لینے کو

پسند نہ کرتے تھے، اور صحیح بات بے جھجھک برملا کہہ دیتے تھے۔

حرص و آز اور تملق سے نفرت تھی، غرور و تمکنت اور رعونت و نخوت کا کوئی شائبہ بھی ان میں نہ تھا، وہ خود ستائی اور خود نمائی کے بالکل عادی نہ تھے، کوئی ایسی بات نہ کرتے جس سے ان کی فضیلت و برتری ظاہر ہوتی، ان کی دینداری ریا و نمائش سے خالی تھی، وہ نام و نمود کے بجائے خاموش خدمت کو پسند کرتے۔

ہر ایک سے بشاشت اور گرم جوشی سے ملتے، انکا آئینہ دل بغض اور کینہ، کدورت سے زنگ آلود نہ تھا، تعصب، تنگ نظری اور جماعتی عصبیت کو سخت ناپسند کرتے تھے، ہر گروہ و مسلک کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، ان کے جنازہ میں بڑا اژدحام تھا جس میں ہر مسلک و مشرب اور ہر فرقہ و گروہ کے لوگ شامل تھے۔ اپنے خوردوں سے بھی نہایت بے تکلفی سے ملتے اور محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے۔ ان کی حوصلہ افزائی کے لئے ان کے معمولی اور ادنیٰ کاموں کی داد دیتے، اپنے بزرگوں اور برابر کے لوگوں سے ہمیشہ عزت و اکرام کا معاملہ کرتے، بڑے مہمان نواز تھے علماء کو اکثر اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے اور جب وہ پہنچ جاتے تو ان کو بڑی خوشی ہوتی اور خوب خاطر مدارات کرتے۔

اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے اور اعزہ و متوسلین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین !!

معارف کی ڈاک

مکتوب لکھنؤ

مکرمی و معظمی زاد مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ادھر علالت نے طول کھینچا۔ یکایک بخار آگیا اور اس نے گویا چور کر دیا۔ کمزوری بھی بڑھی اور درد پا کی تکلیف میں بھی اضافہ ہوا۔ تقریباً بستر تک زندگی محصور ہو کر رہ گئی۔ بارے ادھر کا کرم ہوا تو دھیرے دھیرے طبیعت بحال ہوئی اور اب کچھ لکھنے پڑھنے لگا ہوں۔ دعائے صحت کا طالب ہوں۔

اس سلسلے میں یہ محرومی بھی میرے حصے میں آئی کہ انعام کی مبارکباد آپ کو پہلے نہ دے سکا۔ آپ کی ذات والاصفات انعامات سے بلند و بالا ہے۔ آپ سے منسوب ہونے پر انعام نئی اور پائندہ وقعت پاتا ہے۔ شکر یہ ہے کہ حق کو حقدار تک پہنچنے کا راستہ کسی نہ کسی طرح مل ہی جاتا ہے۔ بہر حال بدیر سہی مبارکباد قبول فرمائیں۔

ایک زمانے میں اکرام صاحب کے تنقیدی اور تحقیقی خدمات پر کچھ لکھا تھا انہوں نے علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عظیم شخصیات پر کچھ ایراد کیے تھے اسی سے متعلق تھا۔ یہ مقالہ غالب انسٹی ٹیوٹ دلی کے ایک سیمنار میں پیش کیا تھا اور ان کے رسالے میں شایع بھی ہو گیا تھا، لیکن روا روی میں لکھا گیا تھا۔ بعد میں کچھ اور مضامین مفیدہ کا اضافہ کر کے مکمل کیا ہے۔ آپ کے یہاں اگر گنجائش

نکل سکتی ہو تو بھیج دوں، کیونکہ مضمون جن شخصیتوں سے متعلق ہے ان کا "معارف" سے گہرا تعلق رہا ہے لیکن مضمون ذرا طویل ہے اور ایک شمارے میں سما نہ سکے گا۔ آپ بے تکلف اپنی رائے سے مطلع کریں۔

ادھر آنکھوں پر مصیبت آگئی ہے۔ پڑھنے لکھنے میں زحمت ہونے لگی ہے۔ کل ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ وہ گلوکوما کا شبہ ظاہر کرتے ہیں، الٹرا ساؤنڈ کا مشورہ دیا ہے لکھنؤ میں صورت حال یہ ہے ڈاکٹر تو بہت ہیں۔ رائے دینے والے بھی بہت ہیں لیکن میرے لیے تو آنکھیں ہی سرمایہ عزیز ہیں۔ کوئی بہت نمایاں ڈاکٹر نہیں ہے رائے دے رہا ہوں۔ علی گڑھ کے اسپتال کا بہت نام سنا تھا۔ دلی کے انسٹی ٹیوٹ میں ایک پورا شعبہ الگ ہے۔ فیصلہ جلد ہی کردونگا۔

والسلام والاکرام

احقر العباد

علی جواد زیدی

ادبیات

احساس نارسائی

از پروفیسر اختر اقبال کمالی۔ کراچی۔

مرے حبیب! ترے قرب کی تمنا سے
مری نظر میں کوئی شے عزیز تر بھی نہیں

تجھی سے لطف و کرم کا امیدوار بھی ہے
یہ دل کہ سوز تمنا سے بہرہ ور بھی نہیں

یہ سچ ہے عشق کا دعوی کرے تو کس منھ سے
جو دل وفا کے تقاضوں سے باخبر بھی نہیں

یہ عشق کیسا جسے تاب سرفروشی کیا
مجال آہ شب و نالۂ سحر بھی نہیں

ترے حضور میں کیا نذر دوں کہ لائق نذر
متاع دل بھی نہیں دولت نظر بھی نہیں

نہ وہ قدم جو تری راہ سے بھٹک نہ سکے
جو پیش غیر نہ خم ہو سکے وہ سر بھی نہیں

نہ سوز عشق جو سینوں میں روشنی کر دے
جو دل کے داغوں کو دھو دے وہ چشم تر بھی نہیں

نہیں متاع دل بے نوا کچھ اس کے سوا
یہ ادعائے غلامی کہ معتبر بھی نہیں

سرنیاز ترے نقش پا سے نامحرم
جبین شوق شناسائے سنگ در بھی نہیں

رہ طلب میں قدم آگے بڑھ نہیں سکتے
کہ طاقت خلش خار رہ گزر بھی نہیں

بچھڑ کے تجھ سے دل مبتلا پہ کیا گزری
بیاں کروں تو یہ افسانہ مختصر بھی نہیں

متاع جاں تری فرقت میں ہوگئی تاراج
اور اس زیاں کی ابھی تک مجھے خبر بھی نہیں

تمام عمر بھٹکتے رہے ہیں میرے قدم
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گزر بھی نہیں

دل و نظر پہ مسلط رہی ہے برسوں سے
وہ تیرگی جسے اندیشۂ سحر بھی نہیں

وہاں پھرا ہوں میں سرگشتہ فکر درماں میں
جہاں کوئی مرض دل کا چارہ گر بھی نہیں

ہیں تیری اک نگہ چارہ ساز کے طالب
وہ دل کے زخم کہ شایان نیشتر بھی نہیں

بس اس یقیں کا سہارا ہے گمرہی میں مجھے
ترے سوا کوئی منزل کا راہ بر بھی نہیں

امید ہے تو تجھی سے کہ تیری شان کریم
دل حزیں کی تمنا سے بے خبر بھی نہیں

نعت النبیؐ

از جناب وارث ریاضی

ساری دنیا کو ہدایت کے پیام آتے ہیں
مژدہ اے بخت! رسولوں کے امام آتے ہیں

اللہ اللہ رے اس ہادی دوراں کے حضور
عرش سے خالق اکبر کے پیام آتے ہیں

تیرگی دہر سے کافور ہوئی جاتی ہے
لے کے قرآن ہمیں خیرِ انام آتے ہیں

میکشو! ہوش میں آؤ "مے ایماں" پی کر
ساقیِ بادۂ توحید بہ جام آتے ہیں

امتِ رحمتِ عالم ہیں، ہمیں غم کیا ہے
وہ مصائب میں تو دشمن کے بھی کام آتے ہیں

حسنِ اخلاق و محبت میں، رواداری میں
ان کا اور ان کے غلاموں ہی کے نام آتے ہیں

تذکرہ ان کے محاسن کا جہاں ہوتا ہے
آسمانوں سے فرشتوں کے سلام آتے ہیں

کتنا خوش بخت ہے وارث جسے اللہ کے بعد
یاد سرکار دو عالم ہی مدام آتے ہیں

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

"نیا دور" نصف صدی نمبر، مدیر جناب سید امجد حسین، بہترین کاغذ اور حسین ترین کتابت و طباعت، صفحات ۲۳۲، قیمت ۱۵ روپے، پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ، یوپی۔

لکھنؤ کا ماہنامہ نیا دور ادبی و تحقیقی رسالہ ہے، جس کے معیار و وقار کی شہرت میں اس کے خاص شماروں کا بڑا حصہ ہے، چند مشاہیر جیسے پروفیسر احتشام حسین، امیر خسرو، بہادر شاہ ظفر، مولانا عبدالماجد دریابادی، غالب، فراق اور منشی نول کشور پر اس نے غیر معمولی شمارے شایع کیے ہیں، ان کے علاوہ اودھ نمبر، قومی یک جہتی نمبر اور یادرفتگاں نمبر جیسے خاص شماروں نے اہل ذوق و نظر سے داد تحسین حاصل کی، اب اس رسالہ نے نصف صدی کا سفر طے کرلیا ہے اور گو اس عرصہ میں بعض سخت مقامات کے سبب کبھی کبھی اشاعت میں تاخیر و بے ربطی سی رہی تاہم اس نے خوش اسلوبی سے اپنا سفر جاری رکھا، زیر نظر شمارہ اس کی نصف صدی کی کارگذاریوں کی یاد و اعتراف کے طور پر ہے، اس میں تحقیق و تاریخ و تنقید، طنزیات و مضحکات و شخصیات پر مضامین نو کے علاوہ ماضی میں شایع ہونے والی بعض عمدہ و نمایندہ تحریروں کا انتخاب بھی آگیا ہے، ایک حصہ میں رسالہ کی نصف صدی کی تاریخ کے متعلق

چھ مضامین ہیں اور یہ سب بہت دلچسپ اور پُر از معلومات ہیں، اس عرصہ کی اردو زبان و ادب کی تاریخ کی ایک جھلک بھی ان سے ظاہر ہوتی ہے' نیا دور کے مدیروں کے سوانحی خاکوں میں جناب سبط محمد نقوی نے جناب امیر احمد صدیقی کے متعلق لکھا کہ "زیارت حرمین شریفین کے باوجود چہرے کو جھاڑ جھنکار سے صاف رکھتے ہیں"۔ اودھ کی زندہ دلی و خوش طبعی کے باوجود محترم نقوی صاحب کی ثقاہت و وضع داری کے پیش نظر اس جملہ سے دامن نظر الجھ کر رہ جاتا ہے شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے مضمون میں علامہ آرزو لکھنوی کے تلامذہ میں احسن دریابادی کا نام حسن لکھ دیا گیا ہے، وہ علامہ کے بجائے جناب جرم محمد آبادی کے شاگرد تھے، ۲۲۳ صفحات کا یہ نہایت حسین و جمیل تحفہ صرف پندرہ روپے میں کسی نعمت سے کم نہیں، مشاہیر ادیبوں و شاعروں کی نادر تصویروں سے بھی یہ مزین ہے، یوپی کے محکمۂ اطلاعات کے لیے یہ باعث مبارکباد ہے تو لایق مدیر کے لیے قابل صد افتخار ہے۔

تحقیق

مدیر جناب ڈاکٹر نجم الاسلام، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۵۹۸، قیمت ۷ ڈالر، پتہ: شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی، نیو کیمپس، جام شورو، پاکستان۔

پاکستان کی سندھ یونیورسٹی کا یہ شعبہ جاتی مجلہ اسم بامسمیٰ ہے اس کے بعض خاص شماروں کا ذکر ان صفحات میں پہلے بھی آچکا ہے، زیر نظر شمارہ میں مقالات و گوشہ متون و مخطوطات وغیرہ ابواب کے تحت تکملۂ مقالات الشعرا، از ڈاکٹر غلام مصطفی خاں، سید ابو العلا، اکبر الہ آبادی از ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر معین الدین عقیل کے مضمون

اردو کی اولین نسوانی خودنوشت کے علاوہ کئی اہم مضامین ہیں لیکن اس کا خاص امتیاز اپنے وقت کے مشہور مصنف و مترجم و محقق جناب قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کی یاد میں گوشۂ اختر ہے جس میں ان کے سوانح، کوائف اور تراجم و تصنیفات و مکتوبات پر اہم تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں، قاضی صاحب مرحوم جامعہ سندھ کے لایق و فایق استاذ تھے، اس گوشہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ علم و تحقیق کے لیے وقف ایسے اساتذہ کے ذکر سے جامعات میں علمی و تحقیقی ماحول پیدا کیا جائے جواب اٹھتا جاتا ہے۔ قاضی اختر مرحوم معارف کے خاص مضمون نگار اور علامہ شبلی و دار المصنفین کے قدر داں تھے، علامہ شبلی کی شاعری پر انکی دو کتابیں شایع ہوئیں، ابن صاعد اندلسی کی طبقات الامم کا انھوں نے ترجمہ کیا تو دار المصنفین نے اسے اپنے سلسلۂ مطبوعات میں شامل کیا، اس گوشہ میں انکے خطوط بھی ہیں اور ان میں بھی اس تعلق کی جھلک ملتی ہے، مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "رسالہ معارف (جنوری ۱۹۱۶ء) کے شذرات میں سید سلیمان ندوی نے مسز سروجنی نائیڈو پر اظہار خیال فرمایا ہے جو میرے خیال میں نثر اردو کے بہترین نمونوں میں شمار ہونے کے قابل ہے اس تحریر میں ناقدانہ اسلوب بیان کے ساتھ ایک طرح کا حسین انداز اور بانکپن نظر آتا ہے" ایک خط میں معارف کے تبصروں پر یہ لطیف تبصرہ کیا ہے" اعمال نامہ کا تبصرہ معارف میں بھی دیکھا، مرنجاں مرنج مبصر (نقاد نہیں) ان مقامات کی صرف تحسین (تنقید نہیں) کرتا ہوا گزر گیا ہے، یہ بھی ایک خوشگوار اسلوب ہے ..." جامعہ سندھ لایق تحسین ہے کہ اس نے قاضی اختر مرحوم کی یادوں کو زندہ کر دیا جو صرف اس کے قابل فخر استاذ ہی نہیں تھے بلکہ بقول جناب سید الطاف علی بریلوی "مملکت پاکستان میں علامہ سید سلیمان ندوی کے بعد صحیح معنی میں علمی شخصیت اگر کوئی تھی تو وہ قاضی صاحب کی تھی"۔

ع۔ ص۔

واقعات کشمیر (تاریخ کشمیر اعظمی) مولفہ خواجہ محمد اعظم

دیدہ مری، ترجمہ وحواشی جناب ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، متوسط تقطیع، بہترین
کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۵۷۶، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی ۱۱۶-
میکلوڈ روڈ، لاہور پاکستان۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف اول میں خواجہ محمد اعظم اعظمی کا شمار کشمیر
کے معروف صوفیہ وشعراء میں ہوتا ہے، لیکن شہرت ان کو مورخ کی حیثیت سے
ملی، انہوں نے اورنگ زیب عالمگیر اور ان کے اخلاف میں محمد شاہ تک مغل حکومت
کے عروج وزوال اور کشمیر پر اس کے اثرات کا مشاہدہ کیا، اس وقت تک
کشمیر کے سیاسی وتمدنی واقعات کے کسی مستند مجموعہ کی کمی نے اس کتاب کی
تالیف پر ان کو آمادہ کیا، وطن ہونے کے علاوہ کشمیر سے ان کو جو تعلق تھا
اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے کشمیر اور شرع کے عدد کی
یکسانی تلاش کرنے کے بعد لکھا کہ "بلاشبہ شرعی امور کی طرف دھیان ملک
ماوراء النہر کے بعد دوسرے بلاد کی نسبت اس شہر میں زیادہ ہے" اس کتاب
میں انہوں نے کشمیر کی ابتدائی تاریخ اور اسلام سے قبل کے راجگان اور پھر
کشمیر کے مسلم عہد کی داستان مرتب کی اور آخر میں ایک باب میں عجائبات کشمیر
کا جدا ذکر کیا، قبل از اسلام عہد کے حالات میں انہوں نے اختصار سے اس لیے
کام لیا کہ اس دور کی اکثر حکایات مبالغہ آمیز اور تاریخی قطعیت وصداقت سے
عاری ہیں، عہد اسلامی کے کشمیر کی تاریخ قدرتاً تفصیل سے بیان کی ہے لیکن اس میں
بھی صوفیہ ومجاذیب کے بارے میں کثرت سے مبالغہ آمیز روایتوں کو نقل کیا
ہے، البتہ مولف کے عہد کے علماء، صوفیہ وشعراء کے تذکرے ان کے علم وفضل کے
واقعات سے معمور ہیں، دید وشنید کا یہ فرق واضح طور پر محسوس ہوتا ہے، کشمیر کی
سیاسی تاریخ پر توجہ کم دی گئی ہے لیکن ارباب کمال کے ذکر سے وہاں کی تمدنی و
معاشرتی زندگی کی تاریخ نمایاں ہوگئی ہے، ایک اور خوبی فارسی اشعار کا حسن
انتخاب ہے، یہ قابل قدر تاریخی مرجع وماخذ قریباً سوا سو سال پہلے اصل فارسی
زبان میں طبع ہوا تھا اور اب گویا نایاب تھا، فاضل مترجم نے اصل نسخہ کو ترتیب
دے کر اس خوبی سے ترجمہ کیا ہے کہ فارسی اسلوب کی دلکشی وشیرینی اور لذت
برقرار ہے، شروع میں حواشی کا اہتمام کیا گیا ہے لیکن بعد میں ضخامت وطوالت
کے اندیشہ سے اسے ترک کر دیا گیا، حالانکہ ان کی سخت ضرورت ہے اور اکثر
عبارتیں اور الفاظ تشریح طلب ہیں، افسوس ہے کہ کمپیوٹر کی کتابت ناقص ہے
اور اغلاط کثرت سے ہیں۔

تربیت اولاد کا اسلامی نظام مولفہ علامہ عبداللہ ناصح

علوان، تلخیص از جناب مولانا محمد قمر الزماں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وکتابت
وطباعت، مجلد، صفحات ۵۹۲، قیمت ۱۱۰ روپے، پتہ: اشرفی کتب خانہ
۱۴۱، بخشی بازار، الہ آباد ۳۔ یوپی۔

پاکیزہ وصالح اسلامی معاشرہ کے قیام کی خشت اول، اولاد کی صحیح تعلیم اور

اصلاح و تربیت ہے اور یہ صرف شریعت مطہرہ کے اصول و احکام کی مکمل بجا آوری پر موقوف ہے۔ موجودہ دور میں عام طور پر اس سے کوتاہی و غفلت برتی جارہی ہے جس کے نتیجہ میں گمرہی و فساد میں بھی افزونی ہے، اس حقیقت کے پیش نظر علماء و مصلحین امت نے وقتاً فوقتاً اس مسئلہ کو اپنا موضوع بنایا، زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی نہایت جامع اور مفید کڑی ہے جس میں قرآن و حدیث اور آثار و اقوال سلف کی مدد اور دردمندی و حکمت سے اس مسئلہ پر مفصل اور جامع تعلیمات کو یکجا کیا گیا ہے۔ انفرادی طور پر بچوں کی نفسیاتی، ایمانی، اخلاقی، جسمانی و ذہنی تربیت اور پھر اجتماعی و معاشرتی تربیت کے عنوان کے تحت نہایت مفید مضامین کے علاوہ مربی و مسائل تربیت پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے، ضمناً عقیقہ و ختنہ و تسمیہ، شادی بیاہ اور مناہی و تعزیرات کے ضروری فقہی مسائل بھی آگئے ہیں، مغربی معاشرہ کی بربادیوں کی مثالیں بھی دی گئی ہیں، اصل کتاب تربیۃ الاولاد فی الاسلام کے نام سے دو جلدوں میں تھی، فاضل تلخیص نگار کے دل میں اس کے اردو ترجمہ کا داعیہ پیدا ہوا، لیکن جب معلوم ہوا کہ پاکستان میں اس کا ترجمہ کیا جا چکا ہے تو انہوں نے عام افادہ کی غرض سے اس کی تلخیص کی اور کہیں کہیں حذف و اضافہ و ترمیم کا فریضہ بھی حسب ضرورت انجام دیا، فوائد کی شکل میں ان کے حکیمانہ اقوال نے کتاب کی نافعیت میں اضافہ ہی کیا ہے توقع ہے کہ آں موصوف کی دوسری کتابوں کی طرح اسے بھی قبولیت عام حاصل ہوگی۔

ع۔ ص۔

دارالمصنفین کی اہم ادبی کتابیں

شعر العجم حصہ اول: (علامہ شبلی نعمانی) فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا عہد بعہد ترقی اور اس کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور عباس مروزی سے نظامی تک کے تمام شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت۔ ۴۰روپے

شعر العجم حصہ دوم: شعرائے متوسطین خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ و ابن یمین تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت۔ ۳۵روپے

شعر العجم حصہ سوم: شعرائے متاخرین فغانی سے ابوطالب کلیم تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت۔ ۲۵روپے

شعر العجم حصہ چہارم: ایران کی آب و ہوا، تمدن اور دیگر اسباب کے شاعری پر اثرات و تغیرات دکھانے کے علاوہ تمام انواع شاعری میں سے مثنوی پر بسیط تبصرہ۔ قیمت۔ ۳۵روپے

شعر العجم حصہ پنجم: قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ۔ قیمت۔ ۳۰روپے

انتخابات شبلی: شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح، عیب و ہنر، شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت۔ ۲۵روپے

کلیات شبلی (اردو): مولانا شبلی کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی قصائد اور تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں شامل ہیں۔ قیمت۔ ۲۵روپے

گل رعنا: (مولانا عبدالحیؒ مرحوم) اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد اردو شعرا (ولی سے حالی و اکبر تک) کا حال اور آب حیات کی غلطیوں کی تصحیح، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ۔ قیمت۔ ۶۰روپے

نقوش سلیمانی: مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمات، خطبات اور ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں اردو کے مولد کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمت۔ ۶۰روپے

شعر الہند حصہ اول: (مولانا عبدالسلام ندوی) قدما کے دور سے جدید دور تک اردو شاعری کے تاریخی تغیر و انقلاب کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ

شعر الہند حصہ دوم: (مولانا عبدالسلام ندوی) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید۔ قیمت۔ ۵۰روپے

اقبال کامل: (مولانا عبدالسلام ندوی) ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح حیات، فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، ان کی اردو فارسی شاعری کی ادبی خوبیاں اور ان کے اہم موضوعات فلسفہ خودی و بیخودی نظریہ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف (عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق کی تشریح۔ قیمت۔ ۴۰روپے

اردو غزل: (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) اردو غزل کی خصوصیات و محاسن اور ابتدا سے موجودہ دور تک کے معروف غزل گو شعرا کی غزلوں کا انتخاب۔ قیمت: ۵۰روپے